

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222959

UNIVERSAL
LIBRARY

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون
۱۶۳	جناب مولوی محمود شیرانی صاحب	تنقید شعرا العجم (نمبر ۱)
۱۸۷	جناب مولوی عبدالمجید صاحب بی لے	اکبر کا آخری دور شاعری (نمبر ۲)
۲۳۵	جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج حیدرآباد (دکن)	احوال اسم
۲۵۵	جناب مولوی سید ہاشمی صاحب کارکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی	راختستان ہاشمی
۲۵۷	جناب محمد عمر صاحب بی لے صدر مترجم لائبریری کونسل عالیہ - جموں کشمیر	عالم ڈراما
۲۷۱	جناب میر احمد علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع ناڈیر - حیدرآباد (دکن)	اصلاح رسم خط
۲۸۹	جناب پروفیسر نعیم الرحمن صاحب	"
۲۹۸	جناب سید الطاف حسین صاحب کاظم - دہلی	"
۳۰۳	جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پرنسپل عثمانیہ کالج حیدرآباد (دکن)	تنقید
۳۰۵	"تمارستانی"	حیدرآباد کا ایک مشاعرہ
۳۱۱	ادٹیر	تبصرہ

تعیید شعر العجم

(۲)

(از جناب مولیٰ محمود شیرانی صاحب)

فرخی

شعر العجم میں فرخی کے باپ کا نام ”قلیع“ (ص ۳) دیا گیا ہے حالانکہ چار مقالہ اور لباب میں صاف جو کچھ مرقوم ہے شاعر کے حالات شبلی نے جیسا کہ ص ۷ کے ایک حاشیہ میں کہا گیا ہے چار دست کے نظامی عروضی سے لیے ہیں۔ فرما رہے ہیں ”گویا میں نے اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے“ اگرچہ وہ لفظی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ بعض مقامات پر تصرفات ہی کیے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

”ابو المظفر خجانی اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے پنج گورنر تھا اور نہایت فیاض طبع اور قدردانِ سخن تھا“ شعر العجم

چار مقالہ میں ابو المظفر خجانی کا البتہ ذکر ہے لیکن یہ خیال کہ وہ اُن ایام میں سلطان محمود کی طرف سے پنج گورنر تھا کہیں ظاہر نہیں کیا گیا نہ چار مقالہ میں ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم یہ عبارت ہو سکے۔ ابو المظفر خجانی کا سلطان کی طرف سے گورنر بن مقرر کیا جانا ایک غلط بیان ہے دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں بیان کیا ہے :-

”فرخی صاحب امیر کبیر ابو المظفر بن امیر نصر بن ناصر الدین مست کہ در روزگار سلطان محمود ~~کے~~ تخلص الی پنج نو“

(تذکرہ دولت شاہ مطبوعہ یورپ ص ۵۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ابوالمظفر چغانی والی چغانیاں اور ابوالمظفر نصر برادر سلطان محمود کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے۔ چغانیہ ماوراءالنہر میں ایک لایت کا نام ہے اور فرخی کے مدوح کا نام ابوالمظفر بن احمد محمد والی چغانیاں ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

تا نقش کرد بر سر ہر نقش بر نوشت
مدح ابوالمظفر شاہ جہانیاں
بن احمد محمد شاہ جہاں پناہ
آں شہر یار کشور گیر و کشور تان

تاریخ بمبئی میں اس کو ابوالمظفر محمد بن احمد لکھا گیا ہے فرخی غالباً نصر ورت شعر اس کا نام ولایت کے بعد لایا ہے۔ چغانی خاندان چغانیہ میں امیر نصر ۳۳۱ھ سے حکمراں رہا ہے، سامانیوں کے دور میں سامانیوں کا برائے نام میطیع تھا، غزنویوں کے عہد میں یہ خاندان برقرار اور بر سر حکومت رہا ہے، آل غزنہ سے ان کے اچھے مراسم تھے، چنانچہ ابو القاسم والی چغانیاں سلطان مسعود غزنوی کا داماد تھا جیسا کہ ۳۴۱ھ سے معلوم ہوتا ہے۔ فرخی اپنے مدوح ابوالمظفر کا ذکر ایک آزاد اور مطلق العنان فرماؤں کی حیثیت کرتا ہے جس کو کبھی خسرو کبھی شہریار اور کبھی بادشاہ کے القاب سے یاد کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ غنچ کے گورنر کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کیا جاسکتا قول۔

”فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اباس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدردانی

کے قصے ہر جگہ مشہور تھے اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اس فریضے میں شکل مل ہوگی“

یہ عبارت نظامی عروضی کے چار مقالہ میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ قول

”فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا تھک کر چور ہو گیا اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا۔ صبح دن چڑھے اٹھا“

(شعر العجم ص ۶۶)

فقرات بالا کے درمیان نظامی کے ہاں یہ عبارت ہے۔ ”آخر الامر رباطی ایران بر کنار لشکر گاہ پدید آمد کر گاہ در آں باطشند، فرخی بنایت ماندہ شدہ بود در دہلیز رباط و ستار زیر سر تہاد و حالی در خواب شد از غایت سستی و ماندگی۔ کر گاہ را شمرند چہل دوسر بودند، رفتند احوال با امیر گھنڈ، امیر بسیار بخندید و گفتیا نمود و گفت مرے مقل ست کا را و بالا گیرد، اور کر گاہ را نگاہ دارید و چوں و بیدار شود مرا بیدار کنید بمشال یا دشاہ را امتثال کردند۔“

دیگر روز بطبع آفتاب فرخی برخواست (چهار مقالہ ص ۴)

باوجود ایسے اختلافات کے جن کی کچھ مثالیں اوپر گزری ہیں مولانا مدعی ہیں کہ میں نے چار مقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے تو

”ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدر دان تھا، اور اس سے نہایت خلوص رکھتا

تھا۔ ربط زیادہ بڑا تو محمود کو رشک ہوا یہاں تک کہ فرخی کا دربار بند کر دیا، فرخی نے متعدد قصیدے

معذرت میں لکھے، بالآخر سلطان صاف ہو گیا اور فرخی بدستور دربار میں جانے لگا“ (شعر العجم ص ۴)

یہاں شبلی نے مجمع الفصحا کی روایت کو فروغ دے کر فرخی کو سلطان کا رقیب بنایا ہے اگر مولانا تھناؤ فرخی کو ذرا زحمت گوارا

فرما کر غور سے مطالعہ فرمائے تو ان کو علم ہو جاتا کہ یہ روایت بالکل لغو اور بے سرو پایہ ہے۔ فرخی کے قصائد سے ثابت ہے کہ سلطان محمود

فرخی سے کسی وقت ناراض نہیں ہوا اور نہ اس نے معذرت میں کوئی قصیدہ لکھا، نہ بابا لال بابا اور چار مقالہ میں فرخی

اور ایاز کی محبت کا قصہ آتا ہے۔ مجمع الفصحا میں اور بھی فرخزفات بھرے ہیں، لیکن یہیں کیا ضرور ہے کہ تحقیق اور تنقید کے

فرائض کو بالائے طاق رکھ کر اور دروغ برگردن راوی مکر صرف نقالی پر اتر آئیں۔ نقل و عیقل یہ کام تو ہر شخص

کر سکتا ہے لیکن نقال اور ہی اور محقق اور قوالہ

”اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے کہ شعرا محمود کی طرح میں جو قصیدے لکھتے تھے اس میں علانیہ

ایاز کے صن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا، فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے

امیر جنگو ایاز اُدمیاق دل و بازوی خسرو روز پیکار

زمان پارا از شوق گردند بہ کاہیں کردنی اورا خریدار

نہ بنیہ بدو دل ادمحود دل محمود را بازی پسندار

مجزا و در پیش سلطان نیز کس بُد جزا و سلطان غلاماں داشت بیا

اگر چوں میر یک تن بود آں جا نہ چندیں بد مراد را گرم بازار

(شعر العجم ص ۴)

یہ نکتہ شبلیا نہ ندرت آفرینی کے مثال ہے اس معاملہ خاص میں مولانا مجمع الفصحا وغیرہ کے رہن منت نہیں ہیں بلکہ اپنی ذاتی اجتہاد کے۔ علانیہ ایاز کی صن و معشوقی کا ذکر تو کجا محمود ایسا جاہل بادشاہ تھا کہ اپنے غلاموں کی طرف کسی کے پوری

نہج کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا ابوالفضل بہت ہی نے اس قسم کا ایک واقعہ اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

ایک وزیر سلطان کے ہاں بڑے فیروزی میں مجلس شراب تھی، امیر یوسف برادر محمود بھی موجود تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ غلام دود و دود لکر نوبت بہ نوبت ساقی گری کر رہے تھے۔ ان میں طفول کی باری بھی آئی۔ طفول اس وقت بکے سُرخ پنہ تھا۔ امیر یوسف پر شراب کا پورا اثر ہو چکا تھا۔ یوسف کی جب طفول پر نظر پڑی دیر تک ٹھکڑی باندھے محویت کے عالم میں بکھتا رہا۔ سلطان کو بھائی کی یہ حرکت ناگوار ہوئی اور کہنے لگا کہ باوا جان نے مرنے وقت عبداللہ دیر کے معرفت پیغام بھیجا تھا۔ میرا بھی کے الفاظ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:-

”محمود را از پیغام من گوئے کہ مرادل بہ یوسف مشغول ست دبرائے تو سپردم باید کہ دے راجہ ی خوش برآری

وچوں فرزند ان خوش عزیز داری۔ داتا این غایت دانی کہ راستاے توجہ نیک کوئی فرمودہ ایم و پند آیم

کہ باادب برآمدہ و نیتی چنان کہ ناپند آشتیم۔ در مجلس شراب رغلماں ماجر کماہ می کنی و ترا خوش آید کہ

ہیج کس در مجلس شراب رغلماں تو نگر و چیت از دیر باز بریں طفول ماندہ است اگر حرمت دوان پدرم

نبودی ترا ملتے سخت تمام رسیدے، این یک با عفو کردم و این غلام را بہ توجہ نیکم کہ مارا چنوب بسیارست،

ہوشیار باش تا بار دیگر چنوسہونیفتہ کہ با محمود چنیں بازیمانہ رود۔ یوسف متوجہ گشت دبر پائے خاست و

زین بوسہ و گفت تو بہ کردم و نیز چنیں خطا نیفتد امیر گفت بنشین نشست و اس حدیث فرامید“ (بہتقی ص ۳۹)

اس سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعرا کے لئے محمود کے مدیہ قصائد میں ایاز کی حُسن و معنوی کا ذکر قریب

قریباً سوار تھا۔ فرخی کے جو اشعار انہوں نے اپنی استمدال میں لکھے ہیں اس سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ دیوان فرخی

اُن کی نظر سے نہیں گزرا، کیونکہ یہ قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ہے بلکہ خود ایاز کی تعریف میں اور اُس وقت لکھا گیا ہے جب کہ

محمود نیاسے انتقال کر چکا ہو اور سلطان مسعود اپنی تخت نشینی کے بعد ایاز کو اس کے حُسن خدمات کے صلہ میں جن کی

تفصیل بھی اسی قصیدہ میں مدح ہو چکی ہے۔ اہم گراں ہوا انعام دیتا ہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے:-

غم نامہ دین آں ماہ دیدار مراد خواہد ریزد ہی خوار

اور گریز کے وقت شاعر گویا ہے:-

زدن برداشت خواہم باراندہ چونزد میر سید یا فقم بار

امیر جنگو آیا زاد میساق دل و بازوے خسرو و زیبار
 اس کے بعد شاعر سلطان مسعود بن محمود کی فیاضی ایاز کی خدمت کے صلہ میں یوں بیان کرتا ہے۔
 خداوند ہماں مسعود محمود کہ اور از رہی بخشہ زخروار
 جزا و را از ہمہ میسر کراد بیک بخشش چل خروار دینار
 نہ دادندش چندین ہیدہ زر بہ چندین و بصد چندین سزاوار
 بجائے قدر میر و حشمت شاہ تو این اخوار دار و اندک نگار
 بجائے برد خواہد خسرو اور کہ سالاراں بد و گرد نہ سالار
 بد و بخشہ چو مال خطہ بست خراج خطہ مکران و قصد ار
 کجا گرد و فراموش آنچه او کرد ز بہر خدمت شاہ جہاندار
 میان لشکر عاصی نگہداشت وفا و عہد آں خورشید احرار
 بر زردوشن از غزنین برفت ہی زد با جانے تاشب تار
 نازش م را چنداں کہ خوانند کہ دشت از کشتا شد شپتہ ہموار
 گر ہے را از ان شیران جنگی کبشت و مابقی راداد ز ہنار
 جزا و ہرگز کہ کردست این بگیتی بخوان شمنائے و تارنج احرار
 خدا یا ناصر او باش از قدر سر را یا تش از خورشید بگزار

فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں اس کا تعلق کس زمانہ سے ہوتا ہے۔ اس غرض کے لیے سب سے صحیح اطلاع اس کے دیوان سے مل سکتی ہے۔ میں ناظرین کے معیت میں دیوان کا مطالعہ ذیل میں شروع کرتا ہوں۔ ضمناً بعض واقعات تاریخ معاصر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

فرخی کے ہاں اسمائے ذیل کی مدح میں قصائد ملتے ہیں۔

- (۱) سلطان محمود غزنوی (۲) عضد الدولہ ابویقوب یوسف بن ناصر الدین شہکلیں، برادر سلطان محمود۔
- (۳) ابوالحسن محمد بن سلطان محمود (۴) سلطان مسعود شہید بن سلطان محمود (۵) خواجہ بزرگ شمس الکفاۃ احمد بن حسن بن

- (۶) خواجہ سید اسعد (۷) خواجہ ابو الفتح علی بن الفضل (۸) خواجہ سید ابو بکر حصیری (۹) خواجہ منصور بن حسن
 (۱۱) ابوالفتح عبدالرزاق بن احمد (۱۲) عمید منصور ابو الحسن (۱۳) ایاز دیماق (۱۴) ابو بکر عبداللہ بن یوسف
 (۱۵) خواجہ ابوسلیم دبیر (۱۶) خواجہ عمید سید ابو احمد غنی (۱۷) خواجہ سید ابوسلیم عراقی وکیل
 (۱۸) خواجہ ابوسلیم رئیس الروسا احمد بن حسن (۱۹) خواجہ سید ابوسلیم عمر کہ خدائے عضد الدولہ
 (۲۰) فخر الدولہ ابوالنظیر محمد بن احمد جفائی -

اس فہرست میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امیر نصر بن ناصر الدین سپاہ لاخر اسالہ در خواجہ ابو العباس فضل بن احمد
 اسفرائینی وزیر (۳۸۵ و ۳۸۶) اول سلطان محمود المتوفی ۳۸۷ھ کا نام داخل نہیں ان جلیل القدر اشخاص کے نام کی
 فرخی کے ممدوحین میں عدم شمولیت ایک قابل تعجب امر ہے۔ فہرست میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جو پانچویں قرن کے آغاز کے
 بعد محمود کے ہاں سوخ اقتدار اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً امیر یوسف، امیر محمد اور مسعود چوتھی صدی کے اختتام پر کسی
 شمار و قطار میں نہ تھے ۳۸۷ھ میں امیر یوسف سترہ سال کا تھا اور امیر محمد اور مسعود چودہ چودہ سال کے ۳۸۷ھ میں امیر محمد
 والی گوزگاناں اور امیر مسعود والی ہرات (بقول فرشتہ) بنائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شعر اس سن کے بعد ان کی
 مع سرائی کرنے لگے ہیں۔

قصائد فرخی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق زیادہ تر امیر یوسف ابن ناصر الدین امیر ابو احمد محمد اور خود
 سلطان محمود سے رہا ہے۔ لیکن اول الذکر امیر یوسف سے اس کو خاص تعلق تھا بلکہ غزنین کی آمد پر سلطانی دربار میں رسائی
 حاصل کرنے سے قبل امیر یوسف کے دربار سے واسطہ پیدا کر لیتا ہے۔ اس وقت تک وہ بالکل گنہگار اور اجنبی تھا چنانچہ فرخی ۵

چو تشنہ گشتہ دگم بودہ مردی بودم بطمع آب رواں گرم گاہ سوئے سراب
 مرا تفصل تو آب داد و راہ نمودہ بہوستانی خوشتر ز روزگار شباب

امیر یوسف کی فیاضیوں نے اسی جلد خوش حال کر دیا ہے۔ فرخی

شکر تو بر من فداواں واجب ست او شہرہ از فداوانی نہ دائم گفت شکرت کیس کدام

چیت نیکو تر ز جاہ از تو رسیدم بجاہ چیت شیریں تر ز کام از تو رسیدم بکام

ابھی مع سرائی کا تعلق قائم بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر نے غالباً اس کا ذکر شکر خلعت بھیجا ہے۔ فرخی

شاعراں رالکھاں خواستہ انگاہند
کہ بدیشاں ہی آزند میچی چو گھر
اومرا خلعت دینا روتے فزود
کہ مراد حجت او گشتہ نبود اندر سر

اس سے ظاہر ہے کہ امیر یوسف نے خواہش کر کے فرخی کو اپنی ہاں بولایا ہے۔

امیر نے ایک مرتبہ بھڑیا کند سے پکڑا اس کے لئے فرخی کہتا ہے
بُجز تو کے بست گرگ، ابکند
اے ترا میر گرگ گیر لقب

امیر یوسف اپنے اسراف کی وجہ سے تنگ دست رہتا تھا اس کے متعلق شاعر کہتا ہے

مرا غم آید اگرچہ مراد لے ست فراخ
زمانِ اَدن و بخشیدن بداں کردار

چناں ملک آباد کہ باشدے ہر روز
خزانہ پردرم و پرسیج و پردینار

چو خنج خویش فروں تر ہی زد دخل کند
ز زروسیم خزانہ تہی بود ناچار

ایک قصیدہ میں امیر کے حاجب طغرل کی کتھنائی کا ذکر آتا ہے جو امیر یوسف نے نہایت دھوم دھام سے کی تھی

از پئے حاجب طغرل کہ نشا ہاں جہاں
حاجے نیست چنو ہیچ کسے را دیگر

بہ پسند دل خویش اور اور خواست زنی
ز تبارے کہ ستودہ است باہل و بگھر

ہرچہ شایست بکردواں چہ باست بد
کارا و کرد تمام و عیش او برد بسر

آں چہ او کرد تہز و مج کیے بندہ خویش
نکند ہیچ شے از پئے تہز و مج پسر

آں نہالے کہ دریں خدمت حاجت نشاند
سر بعیوق برآور و بخت بد ز بر

خدمت میر بدل کرد ہی تا از دل
خدمت او کند امروز ہر آں کو برتر

خدمتش بود پسندیدہ بہ نزدیک امیر
لاجرم میر کلداد مراور او کسر

طغرل حسین ہونے کے علاوہ ظرافت اور لیاقت میں بھی بے مثل تھا، ترکستان سے ارسلان خاتون نے سلطان محمود

کے پاس ہدیہ میں بھیجا تھا، جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا گیا ہے سلطان نے امیر یوسف کو دے دیا۔ یوسف نے اپنے فرزندوں کی طرح

اس کی پرورش کی۔ جب جوان ہو گیا ایک نامی گھرانے میں اس کی شادی کر دی اس عروسی کے متعلق بہت سی کہتا ہے۔

بڑی غیر ضروری تکلف اور تیاریاں کی گئی تھیں جن کو سمجھ دار لوگوں نے ناپسند کیا۔

فرخی کا دوسرا ممدوح امیر محمد ہے۔ امیر محمد معلوم ہوتا ہے اپنے خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور قدردان علم تھا۔
فرخی کئی موقعوں پر اس قسم کی تلمیحات کرتا ہے۔ چنانچہ

قطب معانی ملک محمد محمود	ناصر علم و معین ملت و مختار
اُن کہ زد عویٰ فزوں نماید کار	و اُن کہ ز گفتار بیشین ارد کار
جو دشمن را از وفزوں شدہ قدرت	علم و ادب ابد و فروختہ بازار
اہل ادب ابرگ اردو لگفت	این بزرگیش بس بزرگ مداد
قدر گوہر جز گوہر شناس نداند	اہل ادب ادیب داند مقداد
چشم بدان در بادزاں شدہ کاش	سخت ادب پر درست و علم خرید

دیگر

پدر از ملک زین بیشترین فیتہ بر
پسر از کتب جہاں بیشترین کدہ زہر

دیگر

چوں بابر سرزباں دارد فقہ و تفسیر و مسند و اخبار

تیسرا شخص جس سے ہمارے شاعر کو دل چسپی رہی ہے، خود سلطان محمود ہے۔ فرخی کے ہاں محمود کی زندگی کے واقعات کے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان میں سب سے قدیم فتح قنوج و کالنجری۔ دو قصیدوں میں حملہ سومات کا ذکر آتا ہے۔ دو قصیدوں میں مختصر فتح ری کا ذکر ہے جو محمود کے آخری دوران عسکر کا زمانہ ہے۔ ہم قنوج سے پیشتر کے کارناموں کا فرخی کے ہاں کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر سلطان کے دربار میں ۱۲۰۹ء سے پیشتر جو ہم قنوج کا سال ہے آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سن کے واقعات اس کھماں ملتے ہیں اور قبل کے واقعات نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان کے بھائی امیر نصر اور وزیر سابق فضل بن محمد کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ کیونکہ اس کے آنے سے قبل یہ دونوں طویل المربعہ اشخاص وفات پا چکے ہیں فضل بن احمد ۱۲۰۳ء میں ہلاک ہوتا ہے، امیر نصر کا سال وفات تاریخ میں مذکور نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی وفات ۱۲۰۳ء و ۱۲۰۴ء کے درمیان میں کسی وقت واقع ہوئی ہے امیر نصر کے بعد امیر یوسف سپہ سالار خراسان سبایا جاتا ہے۔

فتح سومنات (۱۶۷۷ء) جس میں غالباً فرخی بھی شامل تھا سلطان محمود کے نمایاں کارناموں میں سے ہے۔ شاعر کو بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے دل میں دُور و آرزوئیں بے حد گدگی لیتی رہی ہیں۔ پہلی زیارت خانہ کعبہ دوسری فتح

سومنات ۵ خدا یگانہ را اندر جہاں دواجبت بود ہمیشہ ایں دہی خواست زانید داور
یکے کہ جائے گمہ حج ہندواں کبند دگر کہ حج کند و بوسہ بردہد بحجر
یکے ازاں دمراد بزرگ حاصل کرد دگر بون خداے بزرگ کردہ شمر

دلہ

توفیق دہ اور ادبیر تا کبند حج چوں کرد شادی و بہ پیروزی بازار
معلوم ہوتا ہے کہ سومنات نے سلطان کی توجہ کسی غیر تاریخی روایت کی بنا پر اپنی طرف اور بھی جذب کر لی تھی۔
دہ روایت یہ تھی کہ مکہ معظمہ میں تین زبردست بُت تھے عزرا، لات اور منات۔ عزرا اور لات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے عہد مبارک میں برباد کر دیئے گئے، لیکن منات کو کافر خُپرا کر ہندوستان لے آئے سومنات اور منات کی ناموں میں
اشتراک یا ہم کی پچیدہ دشواریوں نے اس روایت کو سلطان کے دربار میں معلوم ہوتا ہے بہت کچھ فروغ دیدیا ہے۔
اسی روایت کے زیر اثر صاحب طبقات ناصری سومنات کا نام منات ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ فرخی

ملک ہی بہ تہہ کردن منات شافت تشابہ و ہماز ہر دیں بود اکثر منات دلات و عزراے در مکہ بہت بیفتہ ز دست بُدبت آئے آن ہاں آذر
ہم جہاں ہی آں ہر سر را پستیدند جزاں کسے کہ بود از خدا نظر دوزاں ہمیر شکست ہر دور آرزو فگندہ بودستاں پیش کعبہ پے سپر
منات از میاں کافراں بہ زویدند بخشود گرانداختند ازاں کشور بجایگاہے کز دوزگار آدم باز بہ آں مین نہ نشست نہ رفت یک کافر
زہر آں بُت تجماند سبب کردند در آں خرابہ بہ مندوق ہای پیل گمر بہ تگندہ اندر بت را خزانہ کردند بعد ہزار تاشیل و صد ہزار صور
گمہ خریدند اور از شہر ہا چندان کہ سیر گشت ز گوہر فروش گوہر خراہے سر سبت کلمہ فرد ہشتند نگار کار بیا قوت و بافتہ بگہر
بدر زریکے خود ساختند اورا چو کہ آتش دگوہر بر بجا شمر ہاں ملکتے تاج و انفرش بودہ آست کینہ چیزے آں تاج بود و آں فر
پیل نگہ کردند آں سومنات لقب لقب کہ دید کہ نام اندر بود مضر خبر فگندند اندر جہاں کہ از دریا تیر آمد زیں گونہ و بدیں سپکر
مدتیر ہمہ خلق مست و کردگار جہاں ضیا دہندہ شمس بہ نور بخش فر بعلم ایں بود اندر ہمیل صلیق فساد بحکم ایں بود اندر جہاں قضا و قدر
گردہ دیگر گفتند نے کہ ایں بت را بر آسمان بریں بود جایگاہ و مقر کے نیاد و ایں ابدیں مقام کہ ایں ز آسمان بخواہش خود آمدست اید

بدیں گویہ دزد بدیں گویہ شب بدیں گویہ بحر بدیں گویہ بر چوایں ز دنیا سر بر زد و بختک آمد سجدہ کردند این اہمہ نبات و شجر
 بشیر خویش مرایں ابشت گاو کوں بدیں تقرب خواند گاؤ را مادر زہر سنگی چندیں ہزار خلق خدائے بقول دیو فرشتہ بر خطر لنگر
 فریضہ بہروز آں سنگ ابشتندے بہ آپ لنگٹ بشیر و بہ عرفان ذکر زہر شستن آں بت ز لنگ ہر روک دو جام آب سید سے فزون ز سائے
 ز آب لنگ چہ پیدا کچند فرنگ بسوخت بد آن چا گزده است سر خدائے خواند آں سنگ اہمی ایشا چہ بہندہ سخن ستایں کہ خاک کاغذ
 بر آں نیت کہ مرآں ابکہ باز برند بکند اینک با ما ہی بر دہم سبر

فرخی کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ سلطان کے بعض سفروں میں بھی ہمراہ رہا ہے۔

شنیدہ ام کہ ہمیشہ چناں بدی دریا کہ برد منزل از آواش گوش گرد و کر
 ہی نماید نوبت ہی نماید شور ہی بر آید جوش برابر محور
 سہ بار با تو بریای بیکر اندم نہ موج دیدم و نہ ہیبت نہ شور نہ
 سلطان محمود کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت گھمان کے معرکوں میں فوجوں کا دل بڑھانے کے لئے وہ خود اپنے
 آگے بڑھتا تھا چنانچہ فرخی

من ملک محمود را دیتم اندر و جنگ پیش لشکر خشتین کردہ سپہ ہنگام کار
 فرخی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے قبضہ میں ہاتھوں کی سب سے زیادہ تعداد اس کے آخر حیات میں سترہ سو
 پچاس تھی۔

بعض گاہ تو لشکر چناں کہ باز نمود ہزار و ہفتصد و اندسپیل بدشمار

دیگر

گفت آں ہزار و ہفتصد و پنجاہ کوہ کیت گفتم ہزار و ہفتصد و پنجاہ پیل شاہ
 کابل میں جب پندرہ سوال سالہ کو سلطان مسعود آیا ہی اور ہاتھیوں کا جائزہ لیا گیا ہی تو اس وقت سولہ سو سترہ تھی حالت
 میں موجود تھے اس تعداد میں ہمار اور لاغر جانور شریک نہ تھے۔

فرخی کا اپنا بیان ہے کہ وہ سلطان محمود کے انعامات کی بدولت ایک امیرانہ اور آسودہ زندگی بسر کر رہا ہو وہ کہتا ہے۔
 از فضل خداوند خداوندے سلطان امروز من از دے بہ اسال من از بہار

با ضیعت آبادم و با خانہ آباد با نعمت بسیارم و با آلت بسیار
 ہم با گلہ و اسپم و ہم بارہ میش ہم با صنم خیم و ہم بابت تاتار
 ساز سفرم بہت فوائے سفرم بہت اسان سکپائے دستور ان گزین کار
 از ساز مرا خیمہ چوبت خانہ مانی و ز فرش مرا خانہ چوبت خانہ فرما
 میران بزرگان جہاں احسدید زین نعمت زین مال و زین کار و زین
 محمود بزرگان شدم از خدمت محمود خدمتگر محمود چنین باشد ہموار
 سلطان مسعود کے عہد میں خواجہ نیرنگ احمد بن حسن ہیمندی کو خطاب کر کے کہتا ہے

من بندہ را کہ خدمت من بہت است از بہر خدمت تو پیدا آمدہ بسیار
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخی کو غزنین کے دربار سے تعلق پیدا کیے اس وقت تک تقریباً بیس سال ہو چکے تھے خواجہ احمد
 حسن ہیمندی ۱۲۲۲ھ میں فوت پاتے ہیں اس حساب سے فرخی ۱۱۸۷ھ میں یا اس کے قریب مانہ میں آیا ہے۔
 خواجہ ابوبکر حصیری سے (فقہ) جو سلطان محمود کے ندیوں میں اعلیٰ اور امیر کبیر تھا، فرخی کو بوجہ ہم وطنی خاص اہلہ
 رہا ہے اس کے مدحیہ قصیدہ میں اپنی پچاس سالہ عمر کا بھی ذکر کرتا ہے

خدمت او کن مخدوم شود شاد بزی من ازین گونہ بگردیدم سالے پنجاہ
 حصیری کا زیادہ عروج محمود کے اوخر ایام میں ہوا ہے، غالباً یہ قصیدہ بھی اسی زمانہ کا ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فرخی
 ۱۱۸۷ھ سے کچھ پہلے پیدا ہوا تھا۔

منوچہری

اس سے قبل ایک مقام پر گزارش کیا جا چکا ہے کہ مولانا کے سنہین و تارخ غلط ہوتے ہیں اس قسم کی ایک تازہ مثال
 ذیل میں پیش ہے۔ شبلی فرماتے ہیں۔

”امیر منوچہر بن شمس المعانی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور مہربان کا فرماں داتا اور ۱۲۸۳ھ میں تخت نشین
 ہوا تھا یہ اس کے دربار میں ملازم تھا اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا ۱۲۸۳ھ میں امیر منوچہر نے انتقال

کیا تو یہ غزنین میں آیا“ (شعر العجم ص ۱۸۶)

فلک المعانی امیر منوچہرؒ میں تخت نشین ہوا ہونہ ۳۸۶ھ میں اس کی وفات ۴۲۲ھ میں ہوئی ہونہ ۴۱۱ھ

میں۔ ولہ

”تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے غصری کی شگردی بھی اختیار کی لیکن یہ بھی ایک خوشامد کا پہلو تھا جس طرح قلعہ

میں لوگ ہمدار شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے (ص ۱۸۶ شعر العجم)

یہاں تذکرہ نگاروں بدنام کئی جاتے ہیں غصری کے اسادی کا تو خود منوچہری کو اعتراف ہی جہاں وہ کہتا ہے

کو حریرو کو فروق کو دلدو کو لبسید رو بہ و عجاج و دیک ابن و سیف و وزن

گوفراز آید و شعر اسادم بشنوند تا غزیری روضہ بنیند و طبعی نشن

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

”بہر حال غصری نے اس کو دربار شاہی میں پہونچایا اور سلطان محمد ابن سلطان محمود کے حضور میں ترغاتی کا

منصب ملا یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا کچھ روک ٹوک نہ تھی۔ محمد چنڈوز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار

ہو کر قید ہوا اور اس کے بجائی سلطان مسعود نے تخت سلطنت پر جلوس کیا“ (شعر العجم ص ۱۸۷)

اس کے بعد منصب غانی کا ذکر ہم غزنوی دور میں نہیں پڑھتے اور میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ سلاطین مغول کے عہد میں اچ

ہوا ہے۔ یہ ایک ترکی عہدہ ہونہ ایرانی۔ منوچہری کا سلطان محمد ابن سلطان محمود سے کوئی تعلق نہیں ہا اس لیے اس کے

دیوان میں اس کی طرح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں اور نہ ان ایام میں منوچہری کے دربار غزنہ سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں۔

”دولت شاہ نے اس کو بخنی لکھا ہے چونکہ نہایت دولت مند تھا اس لیے شصت لاکھ کے لقب سے پکارا جاتا تھا“

(شعر العجم ص ۱۸۶)

قبلہ مولانا دولت شاہ کی سند پر منوچہری کو بخنی مان ہے ہیں لیکن اگر منوچہری کے اشعار پر حن کو خود مولانا بھی نقل

کرتے ہیں نہ راجحاً کر لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ منوچہری نہیں ہے بلکہ دامنغانی چنانچہ شعور

چنین تلج عمرایاں مسم بدینا بیامد منوچہری دامنغانی

اس کا لقب شخصت گلہ نہیں تھا بلکہ کسی اور متاخر شاعر کا جس کا نام بقول پروفیسر برٹن (ص ۲۷) عبد دوم شمس الدین احمد منوچہری۔

منوچہری اپنا نسب سامانی شاہی خاندان سے بیان کرتا ہے:

منم از نژاد بزرگانِ سامان کہ بودند شاہانِ چتر و کواکب

نقیہ ہونے کے علاوہ منوچہری عربی صرف و نحو اور علم طب میں بھی کامل تھا۔

من بایں علم دین و علم طب و علم نحو توندانی دال و ذال را و زوایں و شین

عربی ادب میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی، تاریخ عرب اور تاریخ عجم سے خوب واقف تھا، نجوم و ہیئت اور موسیقی کا بھی عالم تھا۔ غیر معمولی حافظہ کا مالک ہونے کی وجہ سے شعرائے عرب کا کلام اس کے در زبان رہتا ہے، اس کی غیر معمولی علمیت فنی، ادبی اور تاریخی تعلیمات نے اس کے دیوان کو مشکل اور اداق بنا دیا ہے، بعض قصیدوں میں وہ لغات کا ابر بن کر گرجتا اور برستا ہے۔ تشبیب نگاری، مناظر قدرت، بہار باغ گل، ریاحین، مرغ و پرند، سفر، شام و صبح برف وغیرہ کے بیان کرنے میں یہ طویل رکھتا ہے۔ جس طرح کہ تشبیہات و استعارات میں جدت قدم قدم پر اس کے ہاں ملتی ہے اسی طرح صنائع بدائع، لفظی لطافتیں، نئی عروضی اوزان کے استعمال میں بھی اسے تقدم حاصل ہے۔ مبالغہ، تکلف اور تصنع اس کے ہاں سب سے پہلی مرتبہ دیکھے جاتے ہیں۔ منوچہری کو اس نئی صنف شاعری کا موجد کہنا چاہیے جس کی ابتدا اور نشو و نما شمال مغرب ایران میں ہوئی اور جس نے قطران تبریزی خاقانی اور نظامی جیسے شعرا پیدا کیے۔ تجنیس کی بدعت منوچہری نے غزل کے میدان میں بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ یہ دل مقبول نہ ہوا۔ گھوڑے کے بیان میں منوچہری کو خاص شغف ہے جس طرح تشبیب کا وہ بادشاہ ہے اسی طرح مدح کے میدان میں اس کا سمنہ قلم اسپ لنگ بن جاتا ہے مدح نگاری کبھی اس کو اس نہ آئی وہ طبیعت کا تمام زور تشبیب پر صرف کر دیتا ہے اور اسی ایک بات نے اس کے دیوان کو موجودہ مذاق میں زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

۲۷۲ھ میں جب ایرانی اور اہل کی طرف سلطان مسعود بن محمود کا گزر ہوا ہے سلطان نے رے سے جلال الدین

ایام میں منوچہری مقیم تھا خواہش کر کے بلایا ہے۔

خواست از رے خسرو ایران از شخصت لیل خود ز تو ہرگز نیندیشد ز چندین سنیں

جب سلطان ان اطراف سے غزنین کی طرف مراجعت کرتا ہی منوچہری بھی کچھ عرصہ کے بعد غزنین پہنچ جاتا ہے

دانی کہ منعتیم بردرگ شہنشہ
تا بازگشت سلطان زلالہ زار ساری

دین شہتا بریم دیں کوہا پیادہ
دو پائے باجراحت و دیدہ گشتہ تاری

امید آن کہ رفتے خواند ملک بہ پیشیم
نختم شود مساعد و زم شود بہاری

اکنون کہ شاہ شاہان بندہ کرد حمت
کوشی کہ حمت شہ از بندہ رگراری

ختم آیت کہ خسرو بر من کنز کوئی
اے دیگ آب یا از من دریغ داری

سلطان مسعود کو اس کی طرز شاعری دل سے پسند تھی

از بہر آن کہ شعرم شہ ابدل خوش آید
بر خاست از تو غفلت سخاست از تو زاری

من شعر بیش گویم کاں شاہ اخوش آید
الفاظ ہائے نیکو ابیات ہائے جاری

گر تو بہر مدیکے چندیں طلید خواہی
نما رنما صبری نہما ربے قراری

مسعود نے بعض وقت خود اشعار کی فرمائش کی ہے۔ منوچہری

درخواستے تو شعرم این آمدت ز رادی
انیت کریم طبعی انیت بزرگواری

اضعاف حرفہائے کر شعر من شنیدی
نیکیت باد و رحمت شادیت و شاد خواری

سلطان مسعود کے دربار سے تعلق پیدا کرنے سے پیشتر منوچہری گرگاں، رے اور خافقین میں رہ چکا ہے

مر مر ابارے بدین رگاہ شاہ ست آرزو
نزری و گرگاں ہی یاد آیدم نرغائیں

پھر مسعود کی شاہانہ فیاضیوں کی طرف تلمیح کرتا ہوا گویا ہے

شاعر انرا درسی و گرگاں در شہراں کوئی
بدہ عدنی بہ پشت پیل آوردہ بزرین

آنچہ این مہر و ہد ہوزے بکتر شاعران
معظم ہرگز بجز اندر نداد و مستعین

جس طرح انشائیہ لکھنؤ میں اسی طرح منوچہری کی آمد نے دربار غزنین میں ایک شور مچا دیا ہے۔ حد جو

تلامیذ الرحمن کا ازلی حصہ ہے بہت جلد اپنا رنگ لایا اور منوچہری کے بہت حاسد کھڑے ہو گئے ان میں شہر ان کی

طرف کا کوئی شاعر ہی جس کا نام باوجود کوشش نہ معلوم ہو سکا منوچہری کے خلاف اس نے بہت کچھ حصہ لیا۔

عام حاسدوں کی شکایت اگرچہ منوچہری کے کئی قصائد میں ملتی ہے لیکن قصائد میں شاعر کا رُئے سخن اسی شروانی کی طرف ہے۔ جب کہ کہتا ہے

سال پارس با تو مارا چہ جدال جنگ خاست
سال پارس با تو مارا چہ جدال جنگ خاست
باش تا سال دیگر نوبت کرا خواہد بدن
باش تا سال دیگر نوبت کرا خواہد بدن
من ترا از خوشیتن در باب شعر و شاعری
من ترا از خوشیتن در باب شعر و شاعری
گر مرا فرموده بودے خسرو بندہ نواز
گر مرا فرموده بودے خسرو بندہ نواز
میر فرمودت کہ ادیک شعر اورا کن جواب
میر فرمودت کہ ادیک شعر اورا کن جواب
لیکن اشعار ترا آن قدر وہاں قیمت نہ بود
لیکن اشعار ترا آن قدر وہاں قیمت نہ بود
گر تو لے ناداں نہ دانی ہر کسے داند کہ تو
گر تو لے ناداں نہ دانی ہر کسے داند کہ تو
من بفضل از تو سنزد و نم تو بال از من فرو
من بفضل از تو سنزد و نم تو بال از من فرو
مال تو از شہر یار شہر یاراں گرد گشت
مال تو از شہر یار شہر یاراں گرد گشت
گر نہ باشد در چنین حالت مزیدے مر ترا
گر نہ باشد در چنین حالت مزیدے مر ترا
ہیچ سالے نیت کردنیار سی صد چار صد
ہیچ سالے نیت کردنیار سی صد چار صد
داں گے گوئی من از شاہ جہاں شاگریم
داں گے گوئی من از شاہ جہاں شاگریم
باز شرواں شود باں جائے کہ دادندت ہی
باز شرواں شود باں جائے کہ دادندت ہی

شک ۲۵ میں سلطان مسعود نے دریا سے جیحوں پر پل باندھ جانے کا حکم دیا۔ اس کے متعلق منوچہری ایک قصیدہ میں کہتا ہے

جز تو نہ بست گردن جیحوں کے بغل
جز تو نہ بست گردن جیحوں کے بغل
دو سال یا سہ سال مراں بود تا بہ بست
دو سال یا سہ سال مراں بود تا بہ بست
در دہت و ہفتہ بہ بستی نوائے ملک
در دہت و ہفتہ بہ بستی نوائے ملک
دریا بدار سپہ کہ بجیحوں گزاشتی
دریا بدار سپہ کہ بجیحوں گزاشتی

سالار خانیں را با خیل و با خدم
کرے ہمہ نگون و نگون نخت و خاکسار
تا بر کسے گرفتہ نہ باشد خداے خشم
پیش تو ناید و نہ کند با تو چار چار
پور تگیں کہ خشم خداے اندر رسید
اور ازاں دیار دو اندبایں دیار
تا گنج او خراب شد فیل او اسیر
تار و زار و سیاہ شد و جان او گنار
او مار بود و مار چو آہنگ او کنی
اندر جہد ز بیم بسور اخ تنگ غار
گر شاہ نامکش و را بود زیں قبل
کز تنگ غار ہیچ امیرے نہ نکشت ماہ
مذکورہ بالا بیانات میں شاعر نے واقعیت کا بہت کم لحاظ رکھا ہے اصلی معاملات کو اس قدر رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی شناخت قریب قریب مشکل ہو گئی ہے۔ پُل کے لیے بہتی کتا ہے۔

”دہتم ماہ ربیع الاول نامہ رفت سوئے بکتگیں چو گان ار محمودی و فرمودہ آمد تا بر جیوں
پلے بستہ آید کہ رکاب عالی را حرکت خواہد بود سخت زود و جواب رسید کہ پُل بستہ
آمد بدو جائے و در میانہ جزیرہ پلے سخت قوی و محکم کہ آلت و کشتی ہمہ بر جاے بود ازاں
وقت باز کہ امیر محمود فرمودہ بود (بہتقی ص ۲۷۰)

جب تمام ضروری سامان اور کشتیاں محمود کے وقت سے تیار تھیں تو ظاہر ہے کہ پُل دہنہ کے اندر اندر آسانی
سے ترتیب یا جاسکتا تھا اس پر شاعر کو فخر اور بے جا فخر کرنے کا موقع ملا کہ جب محمود نے پُل کے لیے دو تین سال
لگائے میرے مدوح نے صرف دہنہتوں کے اندر اندر تیار کر لیا۔
پور تگیں کے خلاف مسعود نے جس مہم کا ارادہ کیا تھا اُس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وزیر اور سران سپاہ
اس مہم کے سخت مخالف تھے پناہی وزیر احمد عبد الصمد کی اس کی نسبت یہ رائے تھی جو اس نے ابو نصر مشکانی سے
ظاہر کی تھی میں بہتقی کے الفاظ دہج کرتا ہوں۔

”وزیر چند بار اُس تمام را گفت می بینی کہ چو خواہد کرد از آب گزارہ خواہ شد در چنین وقت برماند
پور تگیں! بدان کہ جسے بختاں آمد و پنج آب بگزشت این کار سے رست کہ خداے بداند کہ چوں شود او ہام
و غاظر ازیں ماجنہ و بر نصر جواب داد کہ جز خاموشی رے نیست کہ نصیحت کہ بہ تہمت باز گردانا کردنی ست

دہم چشمی دانستند با یک دیگر می گفتند بیرون پرده از هر جنبه چیزے، و بوسعید مشرف رامی فر کردند
تامی بنشت و سود منی داشت چون پیش امیر رسیدند بر موافقت دشمن گفتند کہ در چشم می شد

(بہقی ص ۷۲، ۷۵)

اسی ماہ کی انیس تاریخ دو شنبہ کے روز مسعود نے پل سے عبور کیا اور ترمذ پہنچ گیا۔ بامیس کو ترمذ سے کوچ کیا اور
اسی ماہ کی سب سے کو چغانیاں پہنچا تیسری ماہ ربیع الآخر بڈھ کے روز درہ شونیاں کی طرف بڑھائیں کہ اس طرف تو تھیں
کا سراغ چلا تھا۔ سردی نے ادھر اپنا زور دکھایا برق باری جاری تھی جتنی تکلیف لشکر نے اس سفر میں اٹھائی پہلے کسی
سفر میں نہیں دیکھی تھی۔ نوبیع الآخر کو وزیر کا خط آیا اس میں تحریر تھا کہ داؤد سلجوقی ایک بڑے لشکر کے ساتھ سرخس
سے گوزگاناں کی طرف بڑھ رہا ہے اس کا قصد ہے کہ اند خود کے راستہ سے جیوں پہنچ کر پل توڑے اور دریا پر قبضہ کر کہ
اگر خدا نخواستہ پل ٹوٹ گیا تو تکلیف کے علاوہ بڑی رسوائی کا سامنا ہے۔ امیر مسعود اس خط کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا
پورنگیں اس وقت تک سرمان سے نکل چکا تھا اور درہ پر قابض تھا وہاں کے چپہ چپہ زمین سے واقف تھا علاوہ بریں ہشتیا
بدستے اس کے ہمراہ تھے۔ ناچار امیر مسعود بغیر کوئی کام بنائے لوٹا۔ بارہ کو جمعہ کے روز نہایت عجلت میں روانہ ہوا۔
پورنگیں اس موقع کا منتظر تھا وقت پا کر بھڑپا پڑا کچھ اونٹ اور قتل گھوڑے لے گیا جس سے پریشانی اور بدنامی
ہوئی۔ (بہقی ص ۷۷)

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بیان میں اور منوچہری کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ محمودی دور کے شعرا مثلاً
عنصری اور فرخی کے اکثر بیانات حرف بحرف تاریخ سے ملتے ہیں لیکن منوچہری اپنے زور بیان قادر الکلامی اور جوش
طبیعت کے خاطر واقعات کو بیدردی کے ساتھ قربان کر دیتا ہے۔
منوچہری کے ممدوحین کی فہرست میں یہ نام شامل ہیں :-

- (۱) ابوسعید سلطان مسعود بن مین اولہ محمود (۲) شمس لوزرا احمد بن عبدالصمد زیر سلطان مسعود
(۳) بادشاہ ابوالمنظر (۴) فضل بن محمد (۵) ابوالحسن بن حسن (۶) علی ابن محمد (۷) خواجہ احمد
(۸) خواجہ ابوالعباس (۹) علی بن عبید اللہ (۱۰) بسکقو (۱۱) خواجہ محمد (۱۲) محمد قصری
(۱۳) بوحرب بختیار محمد (۱۴) ابوالحسن بن علی بن موسیٰ عمرانی (۱۵) حمید بوسهل روزنی دبیر سلطان مسعود

(۱۶) ابوزریع بن ربیع (۱۶) اسد بن حارث بن منصور نام جلیلاں -

اسدی طوسی

یورپین تحقیقات منظر ہے کہ واسدی گزے ہیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ہیں اور اسدی تخلص دونوں میں عام ہے۔ اسدی کلاں کا نام ابونصر احمد بن منصور طوسی ہے۔ جو صاحب مناظرہ ہے۔ دوسرا اسدی خرد اس کا فرزند جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور اگر شاسپ نامہ ولعت فرس کا مصنف ہے یہ بیان مجکولطاً عجیب غریب معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ دوزبردست مغربی مستشرق ڈاکٹر ایتمی اور پروفیسر برون اس کے راوی ہیں میں تسلیم کرتا ہوں۔

مولنا شبلی کے پیش نظر اگرچہ پروفیسر برون کی تاریخ تھی تاہم وہ اس اہم مغربی انکشاف کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ ان کی نظریہ پروفیسر "برون کی کہوتی" شاید اس قابل نہ تھی کہ اس پر تصنیع اوقات کی جاتی جس کا بدی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شعرا عجم میں دونوں صدیوں میں تخلیط قائم ہو گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اقلم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے، صاحب آتش کہہ نے اُس کو سلطان محمود کے سب سے سیارہ

میں شمار کیا ہے" (شعرا عجم ص ۱۸۲)

یعنی بسم اللہ ہی غلطی کی محمود کے سب سے سیارہ میں اگر کسی اسدی کا شمار ہو سکتا ہے تو وہ اسدی کلاں ہے اور مولنا اسدی خرد کا حال لکھنے بیٹھے ہیں جو گر شاسپ نامہ کا مصنف ہے۔ اگر مذکورہ بالا مغربی نظریہ پر یقین نہ کیا جائے تو بھی مولنا کا بیان غلط ہے اس لیے کہ صاحب گر شاسپ نامہ سلطان محمود کا ہم عصر نہیں ہے اس کا گر شاسپ نامہ جیسا کہ آئندہ ذکر ہو گا۔ ۵۵۰ھ میں تصنیف ہوا ہے اس لیے وہ محمود کے بعد کا شاعر ہے۔ قولہ

"عراق سے آذربائیجان آیا۔ یہاں کارئیں ابودلف کر کری تھا" (شعرا عجم ص ۱۸۲)

آذربائیجان میں ان ایام میں جیسا کہ قطران تبریزی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے مملانی خاندان بر سر حکومت تھا جو کر کوئی کہلاتا تھا ابودلف کر کری، اران کا بادشاہ تھا جو شردان آذربائیجان اور بحر خزر کے درمیان واقع ہے اران اور ارمن دونوں ابودلف کی زیر حکومت تھے۔ نہیں معلوم مولنا کو یہ مغالطہ کیوں کر پیش آیا حالانکہ اسدی کے اشعار سے

جن کو خود مولانا صفحہ ۱۱۶ پر نقل کرتے ہیں یہ امر صاف ظاہر ہے وہ اشعار یہ ہیں ۵ ملک بولت شہر یزیدیں ۶ جہاندار رازی پاکدیں
اسدی ان ابیات میں اُس کو رازی لکھا ہے۔ شبلی فرماتے ہیں :-

”اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دیانات

دکن کے کتب خانہ میں موجود ہے سلگین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے“ (شعر العجم ص ۱۸۴)

یہ اطلاع ”مستر برون کی کتاب جلد دوم“ سے لی گئی ہے جیسا کہ حاشیہ میں ارشاد ہوا ہے لیکن مولانا پروفیسر برون کا مطلب خاک نہ سمجھے۔ اسدی کی مصطلحات فارسی اس کو اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کہیں موجود نہیں نہ اُس کو سلگین نے شائع کیا البتہ اس کا ایک نسخہ جو پخشبنہ ۹ ماہ محرم ۱۳۳۷ء کو عبد الرحمن بن احمد بن الطیبر نے نقل کیا تھا۔ ڈاکٹر پال ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا ہے۔ عبد الرحمن کا نسخہ دینا میں نہیں ہے بلکہ پاپائے روم کے کتب خانہ میں ہے۔ دار السلطنت دینا میں اسدی کے قلم کی جو کتاب ہے وہ حکیم ابو منصور موفق بن علی ہرودی کی کتاب لابنہ عن جہات اللادویہ ہے جس کو اسدی نے شوال ۱۳۳۷ء میں اپنے قلم سے نقل کیا ہے۔ کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے۔ ”علی بن احمد الاسدی الطوسی الثعالبی“ اس کتاب کو سلگین نے البتہ ۱۸۵۹ء میں چھاپا ہے۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی اس کی تصنیف گرشاپ نامہ ہے۔ ابتدا میں گرشاپ نامہ کا محرک ابو دلف شیبانی کا وزیر محمد اسماعیل حبیبی ہوا (گرشاپ نامہ) ۵

مہی بدستِ راد و بنیانِ دیں	گراں مایہ دستور شاہِ زمین
محمد مد جو دو چرخِ مہنر	سماعیل حبیبی مراورِ ایدر
ز چرخِ رواں تابہ ارمنہ خاک	چہ و چون گیتی بدانتہ پاک

باقی اشعار شبلی نے درج کیے ہیں اس لیے میں دہرانا ضروری نہیں سمجھتا۔

جب ابو دلف شیبانی کو اسدی کے اس راہ کی اطلاع ہوئی اس نے اپنے ملازم کو لوگو کی زبانی پیام بھیجا کہ یہ کتاب میرے نام پر لکھی جائے۔ (گرشاپ نامہ) ۵

بہ پروزی آورد زے من پیام	گزین خدا لولونیک نام
کہ گوید ہی شاہِ فرہنگ جوی	بنام من این نامہ را باز گوی

اگر زانِ فردوسی این را نہ گفت تو باگفتہ خویش گردانش حفت
 کمنوں گر سپہرم نہ سازد کمیں بگویم نصیران شاہ زمین
 اس کے بعد اسدی کتاہی کہ خاکِ طوس سے دوشنوی نگار پیدا ہونے پر تم کوئی تعجب نہ کرنا یہ ایک امر واقعہ
 ہی۔ چنانچہ ۵

دو گویا چنیں خاست باشد ز طوس چہوش ز کوئی تو باشد فوس
 کز نامہ خوب کارے بود زمین رجاں یادگارے بود
 گر شاسپ نامہ مشہد میں دو سال کی محنت کے بعد ختم ہوا۔ اس کے اشعار کی تعداد دس ہزار ہے۔ شاعر نے خامتہ پر
 خود بیان کیا ہے۔ (گر شاسپ نامہ) ۵

شد این استان بزرگ اسپری بہ پیروزی و نیک انخری
 ز ہجرت بدو سپہری کہ گشت شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت
 جزاں کا ندرین استان بدربن زہر در بے گرد کردم سخن
 چنیں نامہ خاتمہ بر شکست کہ ہر دانستہ ز تو اں برگرفت
 بہشتت بزمش ز کا فور خشک گیا ہش ز عنبر درختاں ز مشک
 بے حور نو کردش آراستہ از اندیشہ دوشیزگاں خاستہ
 ز پاک و اں شان ز فرنگ تن زدانش زبان و زمینی دہن
 چناں کم بد اندر سخن پایگاہ بگفتم بستم سپردم بہ شاہ
 برآمد ہی بیت اودہ ہزار دو سال اندریں بردہ شدوزگا
 مباداں نہ بیندہ را آفریں کہ کمتر نوید کیے بیت ازیں

آخری تاکید کے باوجود گر شاسپ نامہ جس قدر برباد کیا گیا ہے مشکل سے اور کتاب اس قدر برباد ہوئی ہوگی۔ قطران
 آذربائجان میں اور اسدی ازان میں اس طرزِ شاعری کے مقلد ہیں جس کے خصوصی جراثیم سب سے پہلی بار منوچہر
 کے ہاں معائنہ میں آتے ہیں۔ یہ صنفِ شاعری صنائعِ بدائعِ لفظی لطافتِ ترکیبوں کی خوش آہنگی، غیر فطری

تشبیہات و استعارات اور صنعت مبالغہ میں اغراق کے لئے مشہور ہے۔ لفظی شان شوکت اور خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف جس کے نمایاں خط و خال ہیں۔

منوچہری اپنے مرکب تشبیہات میں عدیم المثل ہے۔ اسدی نے بعض موقعوں پر اس کی تقلید کی ہے۔ مثلاً یہ شعر
ہمی تافت خنجر ز گرد سپاہ چو ایمان پاک از میان گناہ
دیگر

دوزنقش ہمہ جہیم و جہیم دال دہن ہم و ہمیش از نقطہ حال
قطران صنعت تجنیس کا حاکم ہے اسدی اس کی بھی پیروی کرتا ہے شعر

بزرگاں بزم اندر آرام رام نشستند خفت غم انخابام جام
لیکن یہ صنعت لطیف سچ تو یوں ہے کہ قطران کا حصہ ہے اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا (قطران)

چوں بطرف جوئے بہادہ گل خود رئے رئے جائے بامعشوق می خوردن بطرف جوئے جئے

بردہ از مرجاں گجہ نہ لالہ نعمت سبقت بردہ از مطرب بدتاں لبیل خوش گئے گئے

بستہ از یاقوت و بستہ لالہ و گلزار نار یافت از کا فوج عجب خیری و شبتوئے بئے

از نسیم سوسن و گل گشت چوں قرقیہ بارغ وز دم و زلف بت من گشت چوں مشکوئے کئے

چشم من چوں چشمہ آموئے گشت از ہجر او تن بخوں چوں ریمان چشمہ آموئے موئے

صنعت مبالغہ اس میں شک نہیں اسدی کا خاص حصہ ہے میں بخوف طوالت صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں

شب مورچہ بر پلاس سیاہ (۱) نمودی بہ چشم از دو صدیل راہ

ز گردنبر و ز گرد زیں (۲) زیں گشت گردوں و گردون زیں

خروش چیاں دشت بشکافے (۳) کہ دروے سپاہے گز ریافتے

چیاں تیرہ کیستی کہ از لب خروا (۴) زبں تیرگی رہ نبردی بجوش

فردوسی اور اسدی کی شاعری میں وہی تفاوت ہے جو آمد اور آرد سادگی اور تصنع میں مشاہدہ کیا

جاتا ہے۔

فردوسی کے ہاں جہاں حلاوت ہو اسدی میں ملاحت جھلک مارتی ہر خدائے سخن کی متانت کے مقابلہ میں اسدی کے ہاں چلبلاہٹ اور باکین کا نمک بھی موجود ہے۔ بلند مضمون، منتخب الفاظ، چست بندش، جوش و خروش کی تاثیر، چیدہ نشاۃ بر جستہ اسمائے صفات نے اسدی کے کلام کو زیادہ شوخ اور گھڑنا دیا ہے۔ زبان کی ترقی، وقت کی مسامتت اور طبیعت کی رنگینی اسدی کے حق میں فیصلہ کے لئے جھکتی ہیں، لیکن یہ سچ تو یہ ہے کہ اصل اصل ہی اور نقل نقل۔

شاہنامہ اور گرگشاہ نامہ میں بہت مضامین عام ہیں بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسدی نے شاہنامہ اپنے سامنے رکھ کر گرگشاہ نامہ لکھا ہے۔ مثلاً داستان بیزن کی تمید کے وہ اشعار جن میں ایک تاریک رات کا منظر پیش کیا ہے اور جوشاہنامہ کے قدیم ترین اشعار میں مانے جاسکتے ہیں اسدی ان کا جواب دیتا ہے۔

شاہنامہ گرگشاہ نامہ

شے چوں شبر رے شتہ بقیر	نہ برام پیدا نہ کیوان بتیر	شے بد چوزنگی صحر تر زراغ	میر نو چو در دست زنگی چراغ
دگر گونہ آرائیے کردہ ماہ	بسیج گزر کرد بر پیش گاہ	سیا ہیش در رسم سیاہی بدیر	چو موج از بر موج دریائے قیر
شدہ تیرہ اندر سرائے رنگ	میاں کردہ بار یک دل کردہ نگ	چو ہندو بقیر اندر اندوہ رے	سیہ جامہ و سخ فردہ شتہ موے
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد	سُپرن ہوار از بنگار گرد	چنان تیرہ گیتی کہ از لب خرویش	ز بس تیرگی رہ نہ دی بگوش
سیاہ شب تیرہ بردشت و راغ	یکے فرش افگندہ چوں پر زراغ	میان ہوا جاے جاے ابریم	چو افتادہ بر چشم تاریک غم
چو پولاد ز نگار خوردہ سپہر	تو گیتی بقیر اندر اندوہ چہر	جہاں گفتیش دوزخی ہست تار	بہر گوشت دیواندہ و صد ہزار
نمودم زہر سو بچشم اہرمن	چو مار سیہ باز کردہ دہن	از انگشت بدشاں ہمہ پیرہن	دماں باد تاریک دود از دہن
ہر آنکہ کہ بر زد یکے باد سرد	چو زنگی برا نگشت ز انگشت گرد	زمین اکہ از غار دیدار نہ	زبان ارہ و روسے زلفار نہ
چنان گشت باغ دلپ جو سبار	کجا موج خیزد ز دریائے قار	بزدان شب رہ بند آفتاب	فروہشتہ بڑید ہا پردہ خواب
فروماند گردون گرداں ز جاے	شدہ سست خورشید دست دپاے	فرشتہ گرفتہ ز بس بیم یاس	پری در نیب اہرمن در ہراس
زمین زیر پاں چادر قیر گوں	تو گیتی شدستی خواب اندر	بسان تن بیسواں بد زمین	ہوا چوں نرم سو گئے دل عنیں
جہاں ادل از خوشین پُر ہراس	جرس بر گرفتہ نگہبان پس	براں سوگ بر کردہ گردون رشک	رخ نیلگون پُرمیسرین شرک

نہ آوازے مرغ نہ ہڑلے دو زمانہ زباں بستا زینک وہ تو گفٹی کے آئینہ ست از فراز ستارہ درو چشم زنگی ست باز
 فردوسی کے ہاں اکثر تشبیہات مادی اشیاء سے تعلق رکھتی ہیں، اسدی کی اکثر تشبیہیں ایسی ہیں جو غیر محسوس ہیں۔
 موج دریائے قیر، پیرہن انگشت، زندان شب، دوزخ تار اوہمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسدی نے اپنے رسمی مبالغہ کو
 ہاتھ سے نہیں لیا ہے اور چوتھے شعر میں اپنی برجستہ طرز میں لکھا ہے کہ دنیا اس قدر تاریک تھی کہ نالہ لب سی نکلے ہی ہو یہ
 کثرت تاریکی راہ گم کر کے کہیں کا کہیں بھٹک جاتا تھا اور کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ فردوسی خدائے سخن ہی مبتدئ
 اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تاہم اسدی نے جو کچھ زور طبیعت دکھایا ہے لائق تحسین ہے۔
 بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اسدی نے فردوسی کے خیالات کو اپنے ہاں لے لیا ہے اور سرقہ کی سرحد منسوب
 سے ڈانڈا مینڈا جا ملا ہے۔

گرشاسپ نامہ

شاہنامہ

کہ آبے کرو سرو آزاد درست سز و گرناید برو خاک شست ہر اس کچھ خوردی از آب پاک نشاید فگندن برو سنگ و خاک
 پیامت از مرگ موئے سپید بدون چہ داری تو چندین امید چو پریت سیمیں کند گوشتوار ازاں پس تو جز گوش مردن نہ
 یکے داستان ز دہریں مردہ کہ درویش اپوں برانی زو { یکے را بہ در نہ اند جائے ہی گفت بردہ منم کتھ دے
 گوید کہ من مہتر وہ بدم ہم بندہ بودند و من مہ بدم
 تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ گرشاسپ نامہ نے فردوسی کے خیالات سے اپنی شاعری کو چمکایا ہے۔
 شہنوی کا ایوان جس کی بنیاد رودکی، ابوشکور اور دقیقی جیسے معماران سخن نے ڈالی تھی فردوسی نے اپنے
 زمانہ میں اس ایوان کو نہایت بلند اور عالی شان بنادیا، اسدی نے دھیمے رنگوں میں اس پر بیل بوسے اور نقش
 نگار بنائے، نظامی نے اپنے وقت میں ان رنگوں کو زیادہ شوخ اور لطیف کر دیا۔

اکبر کا آخری دور شاعری

(۲)

(از جناب مولوی عبداللہ صاحب بی. اے)

(ج) عشق و تغزل

غزل گو شاعر کی حیثیت سے اکبر کو شہرت عام کبھی نہیں حاصل ہوئی، تاہم کلیات اول و دوم میں ان کی متعدد غزلیں ایسی درج ہیں جنہیں بلا تامل اساتذہ غزل اردو کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکتا ہے۔ کلیات اول میں جو ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا، حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قایم کیے ہیں۔ سلسلہ بیان کے لیے ان میں سے ہر دور کے نمونہ کلام پر ایک نظر کرتے چلنا چاہیے۔

پہلا دور تا ۱۹۱۶ء۔ اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ گویا یہ ان کی شاعری کے بچپن کا دور تھا۔ شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا۔ اس وقت وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہمہوا نہیں تاہم ہرنگی، شوخی، روانی طبع و لطف زبان کے جوہر اس وقت بھی نمایاں ہیں اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔

بے تکلف بوسہ لطف چلیا لیجئے	نقدِ دل موجود ہی پھر کیوں نہ سودا کیجئے
دل تو پہلے لے چکے اب جان کے خواہاں ہیں	اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجئے
پاؤں پڑ کر کہتی ہی زنجیر زنداں میں رہو	وشتِ دل کا ہی ایسا راہ صحرا لیجئے

سنا ہوں چین میں جو تری زمر نہ سنجی یاد آتی ہے بُلّ مجھے تیر کیسی کی

پھر گئی آپ کی دودن میں طبیعت کیسی
جس حیس سے ہوئی اُلفت وہی معشوق ہوا
یہ وفا کیسی تھی صاحب! یہ مروت کیسی
عشق کس چیز کو کہتے ہیں طبیعت کیسی
کوچہ یار میں جاتا تو نطفہ رہ کرتا
قیس آوارہ ہی جنگل میں یہ وحشت کیسی

جذبہ دل نے مرے تاثیر دکھلائی تو ہی
عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہی
گھنگروؤں کی جانب رکھ دیا آئی تو ہی
پر کروں کیا اب طبیعت آپ پر آئی تو ہی
آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں
بے تکلف آئیے کمرہ میں تہائی تو ہی

دوسرا دور ۱۹۶۶ء تا ۱۹۸۸ء - رندی دہو سنائی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں تاہم جذبات نگاری
کی بنیاد پڑ چکی ہے، اور رنگ تغزل زیادہ بکھر گیا ہے۔ لطف زبان و حسن بیان کا سررشتہ کیسے ہاتھ سے جا نہیں
پاتا۔ فرماتے ہیں ۵

آج آرایش گیسوئے دوتا ہوتی ہے
شوقِ پا بوسیِ جاں مجھے باقی ہے منور
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انسان
جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے چھ
پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے
گھاس جو اگتی ہے تربت چننا ہوتی ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انسان
جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے چھ
موتے مرتے نہ کھلایہ کہ جفا ہوتی ہے
جان کیونکر کھریں تیر قضا ہوتی ہے
ہوں فریبِ ستم یار کا قائل اکابر

غمرہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
میں نزع میں ہوں! آئیں تو احسان ہی ان کا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
بلبل گلِ تصویر کا شیدائیں نہیں ہوتا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشہ نہیں ہوتا
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یار نے کچھ خبر لی، دل نے جھگڑے کیا کیا
نالہ شب سے کیا ہوا آہ سحر نے کیا کیا
کھل گیا سب چال دل ہنستے ہیں دست
ضبط کیا نہ راز عشق، دیدہ ترے کیا کیا

دور سوم۔ ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۰ء۔ اس دور کا کلام رنگ تغزل میں خنکی کا نمونہ ہے۔ طرزِ ادا میں سنجیدگی زیادہ پیدا ہو گئی
ہے، مضمون آفرینی پر زیادہ توجہ ہو گئی ہے، غزل میں اخلاقی و روحانی معنویت کی آمیزش بے تکلفانہ کی جانے لگی ہے، اور جا بجا
ظرافت کا چٹخارہ بھی آنے لگا ہے۔ پھر بھی مسلم و متعارف رنگ تغزل ہی کوئی مصرعہ الگ نہیں پڑنے پاتا۔ مثلاً

دل مرا جس سے بہتا کوئی ایسا نہ ملا
بہت کے بند سے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فرو

طالب زمرہ، بلبل شیدا نہ ملا
کعبہ کو کر دیا گم اور کلیسا نہ ملا

ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قصا بھی آئی
آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا

درو کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی
میں بھی آیا ترے گھر میری بلا بھی آئی

وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی
نبت کو دیکھا تو مجھے یادِ حسد ابھی آئی

ہوئیں اعزازِ جوانی میں نگاہیں نیچی
نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنیچہ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا
شانِ مجبویِ صانع کا نشان لکھا ہے یہ

میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا
دور نہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا

کیا مرے اک دل کو خوش کرنے پر وہ قادر ہیں
ایک کن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا

سب سے پہلے ہوشِ مخرد، وہم و تیسرہ
خانہ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا

شاہدِ بزمِ ازل نے اک نگاہِ ناز سے
عشق کو اس انجن میں مسند آرا کر دیا

شورِ شیریں کا مزار کھا سرِ فرہاد میں
گروں پر دانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع
قیس کو دیوانہ اندازِ سیلے اکردیا
رنگِ گل کو دیدہ ببل کا پھندا کر دیا
اُس نے مجھ کو کیا کیا، دلِ نغمے کیا کر دیا
جس نے یہ سب کچھ کیا اکدر میں کیا کر دیا

وہ حجاب اُن کا آج کت نہ گیا
اک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی
نہ گیا اُن کے دل سے شک نہ گیا
وہ اثرِ دل سے آج تک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا
ایسے ستم کیے کہ مرا قلب ہل گیا
اچھا ہوا مزا تو محبت کا بل گیا
اور اس طرح کہ سینہ کا ہر دغ چھل گیا
تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا
ببل کو وجد آگیا غنچہ بھی کھل گیا
خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہی کروں جو ناز
اپنے ہی دل میں مجھ کو مرار بھی لگیا

اُجھانہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
اُن کی نگہ مست ہے لبریزِ معانی
ناگنی نہ مددِ دل نے مرے طولِ ابل سے
متی ہوئی تاشیر میں غزل کی غزل سے
ادراک نے آنکھیں تپا وہاں میں کھولیں
قرآن ہی شاہد کہ خدا احسن سے خوش ہی
کس حُسن سے، یہ بھی تو سنو، حُسنِ عیش سے

۱۔ اس شعر سے متعلق ایک لطیفہ جو خود حضرت اکبر کی زبان سے سُنا تھا، اس قابل ہی کہ اسے بھی ضبطِ تحریر میں لے آنا چاہیئے۔ لکھنؤ میں منشی حاجی الطرعی مرحوم کا گوردی ایک نہایت راسخ الاعتقاد اور متقشف مذہبی شخص تھے۔ اکبر صاحب فرماتے تھے کہ ”لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا۔ یہ غزلِ مشاعرہ کی ہی۔ جب شمع میرے سامنے آئی، تو میں نے یہ غزل پڑھنا شروع کی جو اس شعر پر پہنچا اور پہلا مصرعہ زبان سے ادا کیا کہ منشی صاحب مرحوم کے چہرہ پر نگاہ پڑی۔ اُن کا تقشف و زہدِ قرآن کے ساتھ اس شاعرانہ آزادی کا متحمل نہ ہو سکا۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ دوسرا مصرعہ سننے کے بعد لائے قائم فرمائیے۔ یہ کہتے ہی دوسرا مصرعہ سنایا، تو منشی صاحب پھر کُٹھ گئے۔ بے اختیار اُٹھ کر بجھے گلے لگا لیا اور نہت دیر تک دیتے رہے، ”شاعر دو اعطی کی جنگ ویزا نزل سے چلی آتی ہے۔ کوئی صاحب اگر ان (باقی پڑھنا آئینہ)

علم آیا خموشی کا تو بس حشر تک چپ ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہی اصل سے
درجہ متحیر کا ہی بے خود ہے نہ روتہ ہی روح کو اُمید ترقی کی اصل سے
سجٹ کھن دنوہیں سمجھتا نہیں اکبر جو ذرہ ہی موجود ہی وہ روزِ ازل سے

دو چہارم۔ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء۔ یہ کوئی مستقل دور نہیں اسے دو رسوم کا ٹکڑہ ہی سمجھنا چاہیے۔ دو رسوم تک کا کلام کلیاتِ اول میں موجود ہی۔ اس کے بعد سے چار برس کا کلام کلیاتِ دوم میں ہی، اس لئے اس حصہ کے لئے ایک جداگانہ دور قائم کیا گیا۔ کلیاتِ اول میں بیشتر حصہ غزلیات ہی کا ہی، کلیاتِ دوم میں یہ تناسب گھٹ گیا ہی اور بقنا حصہ غزلیات کا ہی، اس میں بھی چند اخلاقی، فلسفیانہ، سیاسی و عارفانہ مضامین شامل ہیں۔ تاہم عاشقانہ حصہ بھی لطف و کیف سے خالی نہیں۔ کمنہ مشقی سے بختگی بدرجہ غایت پیدا ہو گئی ہی، اور اُستادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پیدا ہی۔ طبیعت کی آمد، جدت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہی۔

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا اب فکرِ آخرت ہی دنیا کو خوب دیکھا
اس نے خدا کو مانا وہ ہو رہا بتوں کا یا اس نے خوب سمجھایا اس نے خوب بچھا

نہ یہ رنگِ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا یہ جنوں اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غمِ دہر سے بچاتا ہی بشر کو مست رہنا مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ سکے فطرتِ فی ہیں نقشِ کھینچے ورنہ نہ یہ ہوتی چشمِ نرگس نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دلِ دین سب اس کے صدقہ جو وہ خود نما بنا ہی کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فردش ہوتا
حسنِ نظامی اکبر کا کلام سن کے بولے تجھے میں نے لی سمجھتا جو تو حسنِ قوش ہوتا

(بقیہ نوٹ ص ۱۹) مرکز آرائیوں کی تاریخ مرتب کرنے پر کبھی توجہ فرمائیں، تو یقین ہی کہ اس واقعہ کو بھی ضرور درج کریں گے۔ شاعرِ فتح مندی کی اس سے زیادہ دلچسپ اور کیا مثال ہوگی۔

توں سے میل خدا پر نظرِ خوب کمی
شب گناؤں نمازِ سحر، یہ خوب کمی
تھاری خاطرِ نازک کا یہ خیالِ فقط
دگر نہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر یہ خوب کمی
شابِ بادہ و فکرِ مال کا رچہ خوش
جنونِ عشق و خیالِ خطرِ خوب کمی
سوالِ وصل کروں یا طلبِ بوسہ
وہ کہتے ہیں مری ہر بات پہ خیر کبھی

آہ دل سے جو نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یادِ اُن کی ہو بہت عزت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نزع کہتی ہو کہ دھٹی تجھ سے جاں
خشر کہتا ہی منسا لی جائے گی
یادِ ابرو میں ہو اکبرِ محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ایک صوبہ سردی ہو جس کا اتنا جوش ہو
ورنہ ہر ذرہ ازل ہو تا ابد خاموش ہو
آئینہ سے بھی وہ نہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس
شرم کہتی ہو کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہو
حضرت منصور کہتے ہیں انا بھی حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہو
شوقِ وصل شعلہ دیاں کیوں نہ ہو برت میں
ابر کو بھی دیکھتا ہوں برقی در آغوش ہو

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی
واعظ کی بات رہ گئی ساتی کی چل گئی
تیار تھا ناز پہ میں سنکے ذکرِ حور
جلوہ توں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
پھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہو
صیادِ مطمئن ہو کہ کانٹا نکل گئی
چمکا ترا جال جو محفل میں وقتِ شام
پڑا نہ بے قرار ہوا شمع جل گئی
حسرت بہت تری دختر کی تھی انہیں
پڑہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دو پرچم آخری دور میں جو ہمارے اس تبصرہ کا اصل موضوع ہی، تغزل کا رنگ بہت ہلکا پڑ گیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں غزل بہت کم کہتے تھے۔ عموماً سیاسی، اخلاقی، عارفانہ و طریفانہ نظمیں لکھتے تھے۔ غزلیات کے عنوان سے کلیاتِ سوم میں جتنے صفحات وقف کیے گئے ہیں تعداد میں زائد ہیں، لیکن حقیقت غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے۔ عموماً وہ واقعاتِ حاضرہ پر شعریہ خیالات و افکار میں جنھیں غزل کے ساتھ میں موزوں کر دیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی کسی قدر موجود ہے، درمیانی کلام میں بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آخری زمانہ میں یہ خصوصیت تمام دیگر خصوصیات پر غالب آگئی۔ کلیاتِ اول کے پینے ایڈیشن کے شائع ہونے پر کسی ناقد نے اپنی رائے یہ ظاہر کی تھی کہ:-

”مُصنّف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تھنکر، سوچنے والا، صاحبِ فکر یا فلاسفر ہے، جس نے اپنے

خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔“

حضرت اکبر کو یہ رائے نہایت پسند آئی۔ اسے وہ اپنی حقیقی ادب سمجھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جوں جوں ان کی شاعری نچرتی گئی، وہ روز بروز اس خیال کے زیادہ مصداق ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر کلیاتِ سوم سے دو ایک غزلیں لے کر دیکھ کی جاتی ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ غالب اگرچہ غزل کا ہی، لیکن روح اس میں سنہل کی نہیں۔ بامِ دسبواب بھی غزل ہی تھا، لیکن ان کے اندر اکثر شرابِ عشق و تشبیب کا ایک قطرہ بھی نہ ہوتا، بلکہ کہیں اخلاق و نوعطیت کی بخنی ملتی تھی، کہیں طریقت و معرفت کا آبِ طہور جھلکتا ہوتا تھا، کہیں ظرافت کی چاشنی سیاسیات کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آتی تھی۔

ذیل کی غزل غزل ہے، یا ایک رسِ تصوف ہے

نگاہ اُٹھی ہے احساسِ ماسوا کے لیے کماں ہو دل فوراً رکنے اسے خدا کے لیے

رداں ہو کارِ جہاں کیوں ہماری مرضی پر خدا ہمارے لیے ہے کہ ہم خدا کے لیے

عملِ خدا کے لیے ہو تو اس کا کیا کہنا مگر ریایہ بُری صرف واہ وا کے لیے

یلدائے تغزل کے مجنون محلِ یار کو شناخت کر کے بتا بانہ اس کی طرف لپکتے ہیں قریب پہنچ کر دیکھتے ہیں، تو محل کے اندر نہ کسی زہرہ جبین کا پتہ ہی نہ اُس کے عشوہ و انداز کا، اور نہ اُس کے رُئے تہاں زلفِ عنبرین کا، بلکہ ان کے بجائے ایک شیخِ وقت مع اپنے جُبَّہ و دستار کے تسبیح و تہلیل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

خدا کے نام کا ہی احترامِ عالم میں نہ صرف آپ میں ہم میں، تمام عالم میں

اسی کا نام نہ کیوں مرکزِ زہاں پہنچائے کہ اختلاف سے خالی ہو کامِ عالم میں
خدا پرست کو کافی ہو مثلِ ابراہیم زوالِ شمس و تشریحِ صبحِ شامِ عالم میں
یہی مشن تھا جنابِ رسول اکرم کا اور آج انھیں کا تو روشن ہو نامِ عالم میں

لطفِ سماع و ذوقِ نظر کے شیدا ئی دُور سے محفل کی دھوم مُن کر دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور محفل کی رنگینیوں کے
نقوش اپنے نتیجہ کو لبریز کیئے ہوئے ہیں، لیکن جلوہ گاہ کا جب پردہ اٹھتا ہے تو "جنتِ مگھا" و "فردوسِ گوش" کا سارا تختل و پھم پھل
ثابت ہوتا ہے، نہ چنگ ہی نہ ساز، نہ غمرہ ہی نہ ناز، محفل میں بجائے ساز کے سوز ہی، لبوں پر بجائے دہا کے آہ ہی، آنکھیں نہ مہیں
اور چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے خشیتِ آبی سے ہیبت طاری ہے۔ درمیان میں ایک صاحبِ حالِ دلِ دیش اپنی آگ
سے دوسروں کو گرم رہے ہیں ۛ

گوسہی ہوائے شوق نے کی بُو اُس کی نہ نخلِ محفل سے مجھوں نے اڑائی خاک بہت لیلنے نے نہ جھانکا محفل سے
دُنیا کے تغیر کا نہیں جس شیدائے جمالِ باری کو پروانے کو مطلبِ شمع سے ہی کیا کام ہی رنگِ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا جس وقت یہ خنجر تھا گلہ آکھ اپنی ملی تھی قاتل سے
زہِ خشک سے طبیعت اُگھٹا گئی ہو، اور دلِ طرافت کی گدگدی کا طالب ہو، تو یہ رنگ بھی کیسے دُر نہیں۔ ندرتِ وفا
کے ظلمِ ساز کے لئے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے، اس رنگ کی غزلیں بھی موجود ہیں ۛ

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہی باقی جنابِ قبلہ میں کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے
سوہ ڈنڈا بھی اب ہی ضبطِ لپس ہی زباں گرمِ قلب ٹھنڈا ہے

غرض آخری دُور کا جو حصہ غزلیات کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے، اس کا بیشتر جزو ایسا ہے، جیسے رسمی و مجزوی و لغوی معنی ہیں
غزل و حسنِ دل سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہاں ہم جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں پوسے عاشق بن گئے ہیں۔ جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے، خوب کہا
ہی۔ اپنے مرتبہ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے، اور رُحبتِ استاد کی کو کیسے ہاتھ سے نہیں جاتے دیا ہے۔ لطفِ زبان و
سلاستِ بیان ان کی غزلیں کی جان ہے۔ تنقید و افلاق نے بعض ممتاز غزل گو یوں کو برباد کر دیا ہے، لیکن اکبر کا گلستان

ان کانٹوں سے بالکل پاک ہو۔ بیان کی لطافت کے ساتھ ساتھ خیال کی بندی بھی موجود رہتی ہے۔ صورت کے بناؤ سنگاریں آنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب و شائستگی سے غافل ہو جائیں۔ جانتے ہیں کہ کاروانِ سخن میں سب ہی طرح کے لوگ شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو محض محل کی خوش و ضمنی و خوشنمائی سے اپنا جی خوش کر لینگے۔ بعض ایسے ہیں جو محض نشی کی زیارت کیے بغیر دم نہ لینگے۔ یہ نائقہ بان سخن و نون کے دلوں کی ڈوبی اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔

ایک غزل میں رسمی شعر کے خلاف، تماشا گاہِ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں، اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں وہ دن دوپہر مزے لوٹتے ہیں، جن کی تلاش دوسرے شاعروں کو شبہائے مہال میں اپنے نشاط خانوں کی چار دیواری کے اندر رہا کرتی ہے۔ دوسروں کو جو لطیف خلوت میں بھی نصیب نہیں، وہ انھیں جلوت میں ہمہ وقت حاصل ہے۔ لیکن پھر آخر مشرقی شاعر کے جذبات کھتے ہیں اس کو مقطع میں بنا رہا ہے

جلوہ عیاں ہو قدرت پروردگار کا	کیا دل کشا یہ سین ہی فصل بہار کا
نازاں ہیں جوشِ حسن پہ گلہائے دلفریب	جو بے کھار ہا یہ عالم اکھبار کا
ہیں دیدنی تہفہ و سنبھل کے پیچ و تاب	نقشہ کھنچا ہوا ہی خط و زلفِ یار کا
سبزہ ہی یا یہ آبِ زمرہ کی موج ہے	شبنم ہی، بحر یا گیسرِ آبدار کا
مرغانِ باغ زمرہ سبخی میں محو ہیں	اور نایاب ہو رہا ہی نسیم بہار کا
موج ہو اوزِ مزمزہ عندِ لبِ مست	اک سازِ دل نواز ہے مغربِ تار کا
ابرِ تنک نے رونقِ موسم بڑھائی ہے	غازہ بنا ہے روئے عروسِ بہار کا
افسوس سماں میں بھی اکبرِ آداس ہے	سو ہاںِ صبح ہجر ہی اک گلزار کا

عام شعراء جو معنویت کو پس پشت ڈال کر محض الفاظ کی تلاش و خراش میں مشغول رہا کرتے ہیں، ان کی شاعری پر یہ حقیقی شاعر کس قدر صحیح شاعرانہ رائے کا اظہار کرتا ہے

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیان وہ شعر کیا ہی رنگ ہی لفظوں کے خون کا
ذیل کی غزل میں حسن و عشق کے پامال مضمون کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے، آخری شعر اس پایہ کا ہے
کہ کہنے والے کی نجات کے لیے بس کرتا ہے

گھٹنا جاتا ہی مری نظروں میں معتد مرا بڑھتا جاتا ہی شمار ان کے خریداروں کا
 بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑے مر تو ہیں فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
 بے خطر پھرتا ہوں بازار جہاں میں ہر سو کیسے خالی ہی تو کیا خوف ہی عیتاروں کا
 فطرت اٹھی ہی شفاعت کو ملا یک ہیں خموش حشر ہی عشق و محبت کے گنہگاروں کا

عشق کا لفظ ہر شعر گو اور ہر شعر خوان کی زبان پر رہے، ہر نوجوان عشق و عاشقی کا دم بھرتا ہی، عاشقوں کی تعداد اس وقت تک حد شمار سے متجاوز ہو چکی ہی، شعرا، ہر پہلو سے اس مضمون کو باندھ چکے ہیں، دفتر کے دفتر شرح عشق میں لکھے جا چکے ہیں، لیکن آج تک کوئی بھی الفاظ کی مدد سے اس کے مفہوم کو واضح کر سکا ہی؟ قنبا جی چاہے لکھے، قنبا جی میں آئے کیئے، لیکن یہ سب محض لفظی و زبان آوری رہی، عشق کی حقیقت نہ واضح ہو سکیگی۔ اگر اس کیفیت کو کتنے موزوں لفظ طویل در کس نادر اسلوب کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

عشق میں حسن بیانِ جہتِ سلی نہ ہوا
 لفظ چکا مگر آئینہ معنی نہ ہوا

ذرا اسلوب بیان کی بلاغت دیکھنا۔ شاعر کو اپنی طاقت لسانی اور اپنی قوت گویائی پر دعویٰ ہی، بڑے سے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو وہ باتوں باتوں میں سمجھا دیتا ہی، دقایق کی گتھیاں وہ ایک اشارہ میں سلجھا دیتا ہی، اسرار و رموز کو وہ دو فقروں میں سمجھ کر ذہن نشین کر دیتا ہی۔ ”حسن بیان“ اس ساری کیفیت کی ترجمانی کر رہا ہی۔ لیکن عاشق ہونے کے بعد اسے نظر آتا ہی کہ اس کی ساری قوت گویائی جس پر اسے ناز تھا، بیکار ہی۔ یہ نہیں کہ اس کی قوت میں کچھ ضعف آگیا ہو۔ وہ جوں کی توں ہی۔ الفاظ کا ذخیرہ وہی ہی، ملکہ بیان وہی ہی، قدرت زبان وہی ہی، الفاظ اب بھی بہت ہی سہل اور سٹدل زبان سے نکلتے ہیں، تقریر اب بھی اسی طرح بلیغ، شستہ اور دل نشین ہی، یہ سارا مفہوم ”لفظ چکا“ ہی ظاہر ہو رہا ہی، یہ سب کچھ ہی، پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہی کہ معنی کی توضیح نہیں ہو پاتی۔ کیفیات قلبی کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے پاتا۔ شیشہ میں آب تاب چمک دمک پوری طرح موجود ہی، لیکن عکس قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہی۔ ضمناً یہ پہلو بھی (وجہ تسلی نہ ہوا سے) آگیا ہی، کہ تسلی کا تعلق لفظ و زبان

لے مرزا کا وہ مطلع یاد کیجئے

دہر میں نقشِ فادہ جہتِ سلی نہ ہوا ہی یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

نہیں، بلکہ قلب اور اُس کے احساس سے ہے۔

اسی زبان میں ایک دوسرا شعر بھی ہے، وہ افسردگی، یاس و حرمان نصیبی کی ایک لہجہ تھی ہوئی تھی ہے۔ اس کی قدر عمر کے آخری مداح پر پہنچ کر ہوتی ہے۔

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن
کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں کچھ بھی نہوا

دورِ اوّل کے برخلاف دورِ آخر کی اکثر غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر اکڑاؤ تھی ہے۔ لذّت دنیا کا موہوم ناقابل اعتنا ہونا، دنیا کی بے ثباتی، اور اس سے اپنی بے تعلقی، یہ موضوع اکثر غزلوں میں مشترک ہے۔ ذیل کی غزل انہیں جذبات کی ترجمان ہے۔ بعض تشبیہوں کی ندرت و لطافت قابلِ داد ہے۔

دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلبگار نہیں ہوں	بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زلیست کی لذّت نہیں باقی	ہر چہ کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانہ ہستی سے گزر جاؤ نگاہ بے لوث	سایہ ہوں فقط نقشِ بدیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرتِ دوا کی نہیں حاجت	غم کا مجھے یہ ضعف ہی مہیا نہیں ہوں
وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے	اُجھو کسی امن سے میں وہ خار نہیں ہوں
یار مجھے محفوظ رکھ اُس بُکے ستم سے	میں اُس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعوائے تقویٰ نہیں درگاہِ خدا میں	بُت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں
افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں آگے	کافر کے مقابل میں بھی دیوار نہیں ہوں

دُنیا میں رہ کر دُنیا سے بے لوث بے تعلق رکھنے کو بہتے شاعر دُن نے باندھا ہے، لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن لطیف و دل نشیں تشبیہات کی مدد سے یہ مضمون باندھا گیا ہے، وہ اگر ہی کا حصہ تھا۔ ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اگر ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی سے میں اس قدر ضعیف و لاغر ہوں، کہ لوگ مجھے ہمارے سمجھ رہے ہیں، اور دوا کی فکر میں ہیں (شعر ۲)۔ چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی مضامین پر تغزل کا غلاف چڑھایا ہے۔

عشق کا دم بھرنے والے لاکھوں بوالہوس موجود ہیں، لیکن واقعی عشق رکھنے والے کس دوا چاہی مینگے۔ آہیں سب

کرتے ہیں لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ انا الحق کی صدا لگانے والے گلی گلی میں مل جائینگے، لیکن در پر جا کے
یٹے ایک منصور ہی نکلیگا۔ دنیا کی عام خلقت کو سوز و عشق سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، اس کی اہلیت مخصوص اشخاص میں
ہوتی ہے، اس مفہوم کو یہ شاعریوں ادا کرتا ہے

باطن بہت ہیں ایسے جوشعل نہیں ہیں

سینہ میں سب کے دل ہیں سب اہل نہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے

مقبول جو ہوں شاذ ہیں قابل تو بہت ہیں آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں
”مقبول“ ”قابل“ کے تعادل کو جس خوبی سے بنا ہا ہے وہ بھی قابل ادا ہے۔

اس زمین میں ایک اور شعر بھی ہے، اور وہ بھی اس مضمون سے متعلق ہے

وہ کم ہیں ٹرپنے میں جھیں مٹی ہو لذت یوں آپ کی شمشیر کے بسل تو بہت ہیں

بسل تیغ تو ہزار ہا نکل آئینگے، لیکن اس ٹرپ میں لذت پانے والے کتنے نکلیں گے؟ مجاز، حقیقت، سیاسیات و معرفت،
جس پہلو سے چاہیئے، اس شعر کو لیجئے۔ اقصیت سے کوئی پہلو خالی نہ نکلیگا۔

عاشق یہ خوب ہی جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں پھر ناجان سے ہاتھ دھونا ہے، لیکن اگر انجام بنی اس قصد سے باز رکھے

اور دل پر لے آنا ہی قابو حاصل ہے، تو پھر عاشق کیوں کھلائے

ذوق ہوئے کوچہ قاتل کو کیا کروں مہلک سہی یہ شوق گردل کو کیا کروں

اس کی ٹرپ اس کا سوز، اس کا جوش و خروش، ان میں سے کوئی شے وہ اپنے قصد و اختیار سے نہیں پیدا کرتا۔ یہ ساری
کیفیات اضطرابی ہوتی ہیں، اس کا متاثر قلب اس سے خود بخود یہ سب کچھ کرتا رہتا ہے

اظہار اضطراب کا شائق نہیں میں پہلو میں لیکن اس دل بسل کو کیا کروں

ناصر کتے ہیں کہ نظارہ گل ترک کرد تو قل قابو میں آجائیکا، اور عقل ٹھکانے آجائے گی۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہوا

کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں کب ل پر قابو رہنے دینگی

قطع نظر گلوں سے، نہیں مانع جنوں بوئے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

دلِ غصہ صاحب کی ایک مشہور غزل ہے

بات میری کبھی سُنی ہی نہیں جانتے وہ بُری بھلی ہی نہیں
اس کا یہ شعر زباں زد عام ہو گیا ہے

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں نہ اہد ہائے کجخت تو نے پی ہی نہیں
اس زمین میں اُکبر نے جو گلِ ریزی کی ہے، زرا اس کی بھی سیر کرنا ہے

چرخ سے کچھ اُمید تھی ہی نہیں آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں

نہ ہی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

چاہتا تھا بہت سی باتوں کو مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جراتِ عرضِ حال کیسا ہوتی نظرِ لطف اُس نے کی ہی نہیں

اس مُصیبت میں دل سے کیا کہتا ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں

آپ کیا جانیں تدریاً اللہ جب مُصیبت کوئی پڑی ہی نہیں

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا ہنسکے بولے وہ آدمی ہی نہیں

”فالتو“ جیسے غیر فصیح لفظ کو کس خوبصورتی سے کھپایا ہے، اور ایک قافیہ ”سوسائٹی“ کا لانا اکبر کا مخصوص کمال ہے۔ مظالمِ فلک کا شکوہ شاعروں کو روزِ ازل سے رہا کیا ہے، اکبر نے سب کے تجربات سے یہ فائدہ اٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے نہیں قائم کی۔ اور مرے میں ہے (شعرا) پانچویں شعر میں ایک نیا مضمون باندھا ہے مُصیبتِ زدہ کی تسکین کے لیے دوسروں کے مصائب کی مثال اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے، لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے، انکی کوئی نظیر اب تک موجود ہی نہیں ہوئی ہے، وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دے۔ مصائب کے فوقِ الحد ہونے کا یہ ایک نادر پیرایہ اظہار ہے۔ چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے۔ اُن کی داد دینا بغیر آپ بیتی کی مدد کے ممکن نہیں۔

ایک غزل اور ملاحظہ ہو

جلوہ ساقی دے جان لیئے لیتے ہیں شیخ خوش ہوں کہ خاہم تو پئے لیتے ہیں
دل میں یاد اُن کی جو آتے ہوئے شرابی ہو درد اٹھتا ہی کہ ہم آڑ کیئے لیتے ہیں
دور تہذیب میں پریوں کا ہوا دوزخا ہم بھی اب چاک گریباں کو یئے لیتے ہیں
خود کشی منع، خوشی کم، یہ قیامت ہی مگر جینا ہی کتنا ہی اب، خیر جیئے لیتے ہیں
لذتِ وصل کو پڑا نہ سے پوچھیں عشاق وہ مزا کیا ہی جو بے جان دئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لاجواب ہے۔ عارفانہ پہلو بھی ہے۔ کتنا سچا مضمون ہے، کہ بغیر درد کے اُن کی یاد پیدا ہی نہیں ہو سکتی، اور اُسے کس ناچکن سے ادا کیا ہے۔ آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر اپنے اصلی عالم میں چلا گیا ہے۔

اچھوتے اور ناموس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اُس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا، ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل میں یہ نعمت اکبر کے لئے مقصوم ہو چکی تھی۔ فرماتے ہیں، اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں ۷

اس عمد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے اس باغ میں طوطی کے لئے قوت نہیں ہے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا سائیں سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے
لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب افعول و فاعل چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے
نیچر ہی کا مطلع ہے بہت معتبرا کتبہ تم دیکھتے ہو پھل میں کہیں چھوت نہیں ہے
راکبر کا مقام تو نصوف و الہیات کا ”لاہوت“ ہے، لیکن جب قافیہ پہچان کے ”ناسوت“ میں اُترتے ہیں، تو دیکھنے والوں کو ”مبہوت“ کر دیتے ہیں۔ مزید توصیف سے ”سکوت“ ہی اولیٰ ہے۔

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی، شاید اپنے ذوق کی تسکین کا کچھ سامان ان غزلوں میں پاسکیں ۷
عشق کتنا ہے بیانِ حال کی پڑا نہ کر تیرے دل کی خود بخود اُن کو خبر ہو جائیگی

۱۷ کلیات میں یہ مصرعوں طبع ہوا ہے شیخ جی ضبط کریں ہم تو پئے لیتے ہیں
راقم موصوف نے اسے اس طرح پر دج کیا ہے جس طرح اکبر مرحوم کی زبان سے نکلے گا۔

مجھ کو اک حیرت ہوا پشوق کی امیہ
کیا نگاہِ قمر الفت کی نظر ہو جائیگی
میں شبِ نفست میں تڑپوں اور ہویں ہیں
کس طرح مانوں مجھے اثر ہو جائیگی

تجھے لے امید فردا دلِ جاں سیو پار کرتے
ہو تبوں کی خود غامی مری غفلتوں سے قائم
لیا ہم نے بوسہ رخ تو نہ بدگماں ہوا جاں
ترے ہاتھوں کی یہ زینت تو شاخِ گل افروز
مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار کرتے
میں اگر نظر کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
کوئی پھول دیکھ لیتے تو اسے بھی پیار کرتے
ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

کتمانِ از عشق مرے آبِ گل میں ہے
افعی زلفِ مس کا تو سودا برا نہیں
خاموش ہی زبان جو کچھ ہو وہ دل میں ہے
پچیدگی جو کچھ ہے فقط اُس کے بل میں ہے
لکھنؤ کے قدیم مذاق سخن کے دلدادہ ”سودا“ اور ”بل“ کی تو شاید زیادہ قدر نہ کریں البتہ ”افعی“ ”زلف“
”پچیدگی“ اور ”بل“ کی مناسبتوں پر تو ”لوٹ لوٹ“ جائیگے۔ ایسے ہی اشعار کی توصیف و تحسین میں ”دفر کے دفر“
سیاہ کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کی موبوت شیع کرتے ہیں اور ”سلسلہ“ بیان کو ”برہم“ نہیں ہونے دیتے۔
صبر رہ جاتا ہی اور عشق کی چل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی اُمیدوں کا
دل تو بڑھتا ہے طبیعت تو بہل جاتی ہے
مگر اس عنہم سے سانچہ میں تو دھل جاتی ہے
دعہ بوسہ ابرو کا نہ کر غیر سے ذکر
دل لگی میں کبھی تو اور بھی چل جاتی ہے
کوئی کوئی اس رنگ کا بھی شعر فرمائے ہیں جو استادِ امانت کی روح کو وجد میں لے آئے، مثلاً

اُس سرو قد پہ آکبریت سے مر رہا ہوں

اللہ رست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں عموماً وہی کہتے ہیں جو دل میں محسوس کر چکے ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب

نہیں، واردات قلب کا عکس ہے۔ جو گزرتی ہے، وہی دوسروں کے سامنے بر ملا کہہ گزرتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس ایک بات کے اور میرے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں ہے

شعرا کب میں کوئی کشف و کرامات نہیں

دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا، اسے بھی صاف صاف بیان کر دیا ہے

میں اپنے آپ میں، اُن شاعروں میں فرق پایا ہوں

سخن اُن سے سنو رہا ہی سخن ہی میں سنو رہا ہوں

حضرت اکبر کے آخری دور تغزل کا کافی نمونہ دکھایا جا چکا (غمناد و رابتدائی و متوسط کے کلام سے بھی تعارف ہو گیا)۔ حق یہ ہے کہ اکبر کی عظمت ان کے عاشقانہ کلام کی بنا پر نہیں، بلکہ دوسرے اصنافِ سخن پر ہے۔ عشقیہ شاعری (خصوصاً آخری دور کی)، اس جہانِ سخن کی قلمرو کا خام ترین علاقہ ہے، اور اگر محض اس صنف کلام کے معیار پر فیصلہ کیا جائے، تو اکبر کی کرسی امتیاز کو اُس کے موجودہ مقام سے پیچھے ہٹانا پڑے گا۔ بااں ہمہ خالص تغزل میں بھی ان کا مرتبہ اُردو شعراء میں صرف چند ہی سے فروتر ہے۔ روزمرہ کی شیریں اور زبان کی صفائی میں ان کی اکثر غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، اور عاشقانہ تخیل کی بلند پروازیوں میں اگر وہ عموماً غالب کی فضا تک نہیں پہنچ سکتے ہیں تو بھی اکثرت مقامات پر انھیں شیفۂ و آتش کے بازوؤں سے بازو ملائے ہوئے پرواز کرتے دیکھا جاسکتا ہے۔ ابتدائی اور درمیانی ادوار میں اس کی مثالیں بکثرت ملینگی۔ آخری دور میں کمتر۔

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی روح ان کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات ہیں۔ ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں، آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دُچیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اول سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دور میں فاقہ قائم رکھی۔ ایک طائفہ جس کا تعلق پیرایہ ادا و انداز بیان سے تھا۔ دوسرے اصلاح معاشرت و تزکیہ اخلاق جس کا تعلق موضوعِ سخن و مفہوم

کلام سے تھا۔

اکبر کی شاعری کے نمود ترقی کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کا سرب آفر، اور بیسویں صدی کا ختم اول ہی۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مغربی تمدن، مغربی اخلاق، مغربی معاشرت، غرض مغربیت کے انتہائی عروج و شہج کا ہی۔ اکبر جب دنیا کی روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک قوم کی حالت یہ ہے، کہ عذر شہداء کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں، ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجے میں پوری طرح کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی ادب، اسلامی شعائر و مذمت ہوئی رخصت ہو چکے ہیں۔ ثروت و خوشحالی کا اول تو وجود ہی غنقا ہو رہا ہے، اور پھر جو کچھ ہی وہ عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے لئے وقف ہے۔ تعلیم و تربیت، اتحاد و اتفاق، نظم و انتظام، ضبط و خود داری، ہمت و ہند نظری، صداقت و حق پرستی، قناعت و ایثار میں سے کوئی ایک شے موجود نہیں۔ عقاید میں تزلزل آچکا ہے، ایمان کی مضبوطی ایک افسانہ پارینہ رہ گئی ہے، حرص و طمع، مکر و نفاق، خود غرضی و غدار نفس پروری و عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بٹھا ہوا ہے۔ دادخواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں، تعلیم کے لئے انگریزی مدرسے ہیں، سفر کے لئے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لئے انگریزی شفا خانے ہیں، ریل و رسائل کے لئے انگریزی ڈاک خانے ہیں، مہاجنی کے لئے انگریزی کوشیاں اور بینک ہیں، مہنی سے واقفیت کے لئے انگریزوں کی کتابیں ہیں، حال سے باخبر ہونے کے لئے انگریزوں کے اخبارات ہیں، مستقل کی ٹیکو کے لئے انگریزی سائنس ہے، عزت و حکومت کے لئے انگریزی عہدے ہیں، حصول زر کے لئے انگریزی پیسہ و بریسٹری و کالت، ڈاکٹری، انجینیری وغیرہ ہیں، زینت و آرائش کے لئے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں، نشا و نفیر کے لئے انگریزی پارک اور انگریزی تماشہ (ٹھیٹر وغیرہ) ہیں۔ غرض جس طرف بھی رخ پھرتا، حد نظر تک ایک غیر محدود نامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا۔

اپنی اس پستی اور ان کی اس بلندی، اپنی خاک نشینی اور ان کی فلک پر بازی کو دیکھ کر بعض نیک نیت ہمدردان قوم کی، جن کی آنکھیں اس جگہ گاہٹ سے خیرہ ہو چکی تھیں، یہ رائے ہوئی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنی دنیا "ان" کی تقلید میں درست کر لی جائے، دنیا ٹھیک ہو جائے، تو دین بھی درست ہو جائیگا، ڈوبتے ہوئے شخص کو جان بچانے کے لئے گھار کے تنکے کا سہارا کافی نظر آتا ہے، تاریکی اور دیرانہ میں انسان کو اپنے سایہ پر بھوت کا گمان ہوتا ہے، سوئے ہوئے شخص

کے کمرہ میں دفعتاً تیز روشنی کر دی جائے تو وہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اُس وقت قوم کا تھا۔ اضطرابِ قلب انتشارِ خاطر، احتمالِ جوکس، واجتماعِ حوادث کے وقت دیویں پری کا سُن و جمال معلوم ہوا، عجز و ہفتاد سالہ پرنا زمین شانزدہ سالہ کا دُھوکا ہوا، دیریں جہم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار بحال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے۔ تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے۔ تہذیب و شایستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے۔ لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منہاٹے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہد حاصل کئے جائیں۔ انگریزی حکومت کی برکات کا وعظ کیا جائے اور اپنے ہوطنوں اور ہم قوموں کو نقصان پہنچا کر انگریزی دربار میں رُسوخ حاصل کیا جائے عقل و دانش کا مفہوم یہ قرار پایا کہ ہر انگریزی مصنف کے ہر قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے، انگریزی قانون، انگریزی فلسفہ، انگریزی سائنس کو ہر قسم کی تنقید و فقہ سے ماوراء سمجھ لیا جائے اور اپنے علوم و فنون اپنے شعائر و رسوم اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنمِ دل رُبا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ اردو زبان اس لئے حقیر نظر آنے لگی کہ یہ ”سرکار“ کی زبان نہیں۔ پردہ کی رسم اس لئے غلامی نواں کی مرادف معلوم ہونے لگی کہ انگریزی خواتین کا شمار بے حجابی کا ہے۔ تعداد و وراج کا دستور اس لئے شرمناک محسوس ہونے لگا کہ انگریزی قوم ایک سے زائد منکوح بیویاں رکھنے کو ضابطہ سے نا آشنا ہی۔ عرش کے انکار پر سب قوی دیں یہ قائم ہوئی کہ انگریزی ہمت و جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، شیطین، جنات و ملائکہ کے وجود کے ابطال کے لئے یہ دیں قطعی نکلی کہ انگریزی سائنس کسی آلہ کی مدد سے ان کا مشاہدہ نہ کر سکا۔ معجزات کا دعویٰ اس لئے قابل مضحکہ ٹھہرا کہ مل و اسپنسر ان کے قایل نہیں۔ نبوت و الوہیت کے عقائد میں اس لئے رخنہ ہونے لگے کہ کاسلر و ہیوم مشکوک رہے ہیں۔

غرض فرش سے لے کر عرش تک، ذرہ سے لے کر آفتاب تک، کوئی شے ایسی نہ تھی جو اصنام مغربی کا کلمہ نہ پڑھنے لگی ہو۔ ساری فضا مغربیت کے زہر سے مسموم ہو چکی تھی۔ ”اقبال سرکار“ ”عقل فرنگ“ ”دانایان مغرب“ جیسے فقرہ جو اسی دُور مرعوبیت کی یادگار ہیں، حقایق متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ دُنیا کی

تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہ تھا۔ سنت الہی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ جب کسی قوم کی بد اعمالیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں اور نوز ایمان ماند پڑ چکتا ہے، تو اُس کی آنکھوں کو عیب، ہنر کی غفلت، نور کی اور زخم، مرہم کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ذٰلِکَ
لَهُمْ اَعْمَالُہُمْ فِیْمَ یَعْمَلُوْنَ (غل رکوع ۱)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی نظر میں ہم انہیں کے اعمال بد کو خوشنما کر دکھاتے ہیں اور وہ اسی میں پڑے بھٹکتے رہتے ہیں۔

ان بد بختوں پر لعنت بھی شروع ہی سے مسلط رہی ہے کہ مادیت دُنیا پرستی میں منہمک ہو کر ان لوگوں پر مضحکہ کرتے رہتے ہیں جن کی روش ہدایت، نیک کاری و تقویٰ کی ہوتی ہے۔

زَیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَ
یَسْحَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (بقرہ ۲۶)

کافروں کی نظر میں حیات دنیوی خوشنما کر کے دکھا دی جاتی ہے، اور یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ مضحکہ کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر (اور ایک حد تک دوسری قوموں پر بھی) پوری طرح یہی شامیتیں اور بد بختیاں مسلط تھیں۔ نام نہاد مصلحین خود خواب غفلت میں مست تھے۔ سرسید اور ان کے انصار و رفقاء خواب دیکھتے دیکھتے صدا لگاتے کہ ”جس حد تک ممکن ہو، انگریز بن جاؤ“ مولانا حالی درمیان میں چند لمحوں کے لئے آنکھیں ملتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھنے لگتے ہیں، لیکن ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے پھر تھپکیاں دے کر سُلا دیتے ہیں، اور اُس پاس کے سونے والوں کے ہم آواز ہو کر وہ بھی خواب میں بڑانے لگتے ہیں۔ مولانا شبلی بظاہر یورپ کے مد مقابل بن کر اکھاڑ دیں اُترے اور نادیدہ حریف پتیری بدل بدل کر خوب خوب وار کئے، لیکن حالت یہ رہی کہ ادھر کسی حریف کی آمد کا نام لیا اور ادھر سُٹا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ قیاس ہوتا ہے کہ مولانا بھی ساری عمر مصروف خواب ہی رہے، بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان اُٹھ کر چلتا پھرتا اور سارے کام کج کرتا ہے، لیکن پھر بھی سوتا ہی رہتا ہے اور اس کی تمام حرکات بیداری کی نہیں بلکہ نوم ہی کی ماتحتی میں انجام پاتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاید مولوی صاحب موصوف کی بھی رہی۔

بر حال یہ فضالتی جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں، یہ ماحول تھا جس میں انہیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ وہ سہمی شاعر نہ تھے، قافیہ پیمائی ان کا مسلح نظر نہ تھا۔ مشاعروں کے لئے طرعی غزلیں تیار کر کرنا ان کا جو ہر کمال نہ تھا۔ وہ ایک

خاص مقصد حیات لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بوجھ ان کے شانہ پر تھا۔ فطرت کی جانب سے وہ ایک رسولؐ ہو کر آئے تھے۔ ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردِ عمل تھا۔ ان کی شاعری اوّل سے آخر تک اسی مادیت و مغرب پرستی کا جواب ہے۔ ان کے ترکش کا ایک ایک تیرا سی ہدف پر آکر گرتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی نظافت، ان کی سیاسیات کے دائرہ کی معمولی پیمائش بھی ممکن نہیں، تا وقتیکہ اس مرکزی نقطہ پر نظر نہ قائم رکھی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع سے تھا، رفتہ رفتہ اس میں ارتقاء ہوتا رہا، یہاں تک کہ آخر زمانہ میں ہر سانے سے ہی نغمہ پیدا ہونے لگا تھا عورتوں کی پردہ دری کے متعلق ان کا یہ مشہور و معروف قطعہ بہت قدیم ہی ہے

آئیں جو بے حجاب نظر چند بیویاں اکبر زمین میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں آپ کا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

قوم کی موجودہ حالت انتشار جو خود اپنی ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے، اس کا نقشہ بھی بہت مدت ہوئی جب ان کے قلم نے کھینچا تھا۔

مذہب کو لیا تو بحث میں سٹوٹا چاہی اصلاح تو حسد را ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیاتِ سوم میں اصلاح معاشرت، تزکیہ، اخلاق، احیاء شعایر اسلامی، و تجدید تہذیب مشرقی کا دغظ سطر سطر میں ملتا ہے۔ لیکن یہ خیال رہی کہ مولانا حالی کی طرح اکبر ترے واعظ نہیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں۔ پھر واعظ پہلے ظریف ہیں۔ پھر معلم اخلاق، پہلے نقاش فطرت ہیں، پھر مصلح معاشرت۔ ان کی مجلس میں جام شراب کا دُور چلتا ہی تجنی کے پایا و تقسیم نہیں ہوتے۔ یہ اور بات ہے کہ حلق سے اتارنے کے بعد وہ شراب، شراب طہور ثابت ہو۔ لا یتہا غول ولا ھم عنہا ینزفون

لے رسولؐ، بمعنی قاصد، سفر یا مہر یہ تو صبیح ان حضرات کے ”باس خاطر“ ضروری بھی گئی جو بحال دریا دلی قنادائے کفر کی تقسیم فرماتے رہتے ہیں۔ راقم معنون کو اس تقسیم سے بہت بڑا مصدّل لگا ہی اور اس کے ساتھ میں اڈیٹر صاحب اردو بھی محروم نہیں رہے ہیں۔ لے اکبرؑ نے خود ایک جگہ اس خیال کو نظم کیا ہے کہ ”لوگ مجھ میں اور مولانا حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں۔ میں جواب دیتا ہوں کہ شراب اور غنی کا موازنہ ہی کیا؟ افسوس ہے کہ وہ انشاعاً فلفہ میں نہ رہے اور کسی مطلوبہ کلیات میں موجود نہیں۔“

یاد ہو گا کہ اکبر سے کچھ قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بھی یہی مشن لے کر پیدا ہوا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے بھی پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، اور بنگالی زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی۔ بنکم نے اپنا حربہ نشر کی شمشیر عریاں کو رکھا۔ اکبر نے اس کے بجائے نظم کے نشر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا اور اکثروں نے شاہش اور واہ واہ سے ہمت افزائی بھی کی۔ اکبر کا نشر عموماً زیرِ مائیتیں رہا اور لوگوں کی نظر سے مخفی۔ البتہ اس کی گدگدی اس غضب کی تھی کہ بسل بجائے کر اہنے اور ترپنے کے اکثر فرط انبساط سے لوٹنے لگتا۔

جدید تہذیب تمدن کا ایک بہت بڑا منظر آزادی نسواں ہے۔ اس شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت ہر یکا بے پردگی بے جانی، بے عصمتی کی ہے۔ اکبر کے ترکش کے اکثر تیردوں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکتی ہے، وہاں شوہر سے بھی حمیت و غیرت سلب ہو جاتی ہے۔ اکبر کے نگار خانہ میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پادیراں ملے گا۔ خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں ہندو۔ حجاب اُن کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس افراط سے دائر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے دوران میں جن حیا سوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، وہاں کے اخبارات جس کثرت سے اور جس لطف و ذوق کے ساتھ اسرار خانگی کو طشت از بام کرتے رہتے ہیں، وہاں کے ادنیٰ نہیں بلکہ متوسط و اعلیٰ طبقات میں بھی ازدواجی زندگی جن دشواریوں، تلخیوں اور حرماں نفسیوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے، یہ سب آزادی نسواں کی برکات ہیں۔ سرکار انگلیزی کے طفیل میں ہندوستان بھی ان برکات سے مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات مہم دم نہیں رہی ہیں۔ لیکن ابھی چوں کہ احساس حمیت و غیرت بالکل مُردہ نہیں ہو گیا ہے، اس کو وقوع واقعہ کے بعد کبھی صورتیں تاسفِ مذامت کی بھی رونا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیت اکبر کی زبان سے سنئے

کیا گزری جو اک پنے کے عدور و روکی پولس سے کہتے تھے عزت بھی گئی دولت بھی گئی بیوی بھی گئی زیور بھی گیا اس غزل کے اور جو چند شعر ہیں در دو عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لئے اگر انھیں بھی لیا سنا دیا جائے تو شاید زیادہ بے محل نہ ہو

اکبر نے محابّت خانہ میں زحمت بھی ہوئی اور زبردی گیا
 پروانہ کا حال اس مغل میں ہو قابل رشک اہل نظر
 کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا کعبہ ہی گیا جبل سے نکل
 جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اُس قصر پہ کل رویا میں بُت
 کیا گزری جوالہ

ایک جگہ بے پردگی اور تعلیم نسواں کے تلامذہ پر کتنا لطیف شاعرانہ استدلال کیا ہے۔
 مجلس نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو
 پیشِ عرانہ تخیل اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے کہ پردہ شکن گروہ کی طرف سے بڑی
 دلیل ہی پیش کی جاتی ہے کہ پردہ کی چار دیواری میں رہ کر علم کی تازہ ہوا نصیب ہونا ممکن نہیں۔ اور علم و تعلیم کا
 جو مفہوم اس گروہ کے ذہن میں ہے اُس کے لحاظ سے یہ قول ہے بھی بالکل بجا۔

مشرق میں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ گھر کی اندرونی زندگی کی مالک ہو، خانہ داری کا اعلیٰ سلیقہ رکھتی
 ہو، بچپن میں والدین کی اطاعت اپنے لئے باعثِ شرف سمجھے، اور نکاح کے بعد شوہر کی خوشنودی کو پروانہ جنت
 خیال کرے۔ نظام خانگی اس کی ذات سے درست رہی خاندان کی مشرتیں اس کے دم سے قائم رہیں اور اولاد کو
 تربیت کے بہتر راستہ پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزت و محبت، بڑوں کی تعظیم و خدمت گزاری اور چھوٹوں کی اُلفت
 و شفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے، اور انھیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ مغرب میں
 عورت کا معیار عزت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعث
 توہین و تحقیر ہے۔ فرہنگ مغرب میں الفاظ اطاعت و خدمت گزاری محکومی و غلامی کے مراد ہیں۔ فرنگیوں کا
 قول ہے کہ عورت اطاعت کے لئے نہیں حکومت کے لئے آئی ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ گھر کے اندر پڑی سڑکے

لے اس شعر کا تعلق اکبر کی آپ بیتی ہی ہے۔ ان کی کوٹلی عشرت منزل (الہ آباد) آج سے پچیس تیس سال اُدھر حقیقتہً عشرت منزل تھی۔ ہر روز
 دعوتیں ہر شب جلسہ، ہر وقت پہل پہل ہنسی مذاق۔ سامانِ آرائش، فرنیچر، وغیرہ سب اعلیٰ درجہ کا۔ آخر زمانہ اس کے بالکل عکس حالت تھی
 پائیں باغ ویران، مکانِ سُنان، اسبابِ نمائش آرائش غالب ہر طرف سُناٹا چھایا ہوا۔ ایک خود حضرت اکبر ایک ملازم اور ایک بوجھا
 ملا۔ کل آبادی اس قدر رہ گئی تھی۔

اور ہر وقت شوہر ہی کے پاس گھٹ گھٹ کر رہا کرے، بہترین عورت وہ ہے جس کے حسن گفتار حسن رفتار حسن صوت حسن صوّت، بالکمال رقص کے کارنامہ منظر عام پر آتے رہیں، جس کے فوٹو اخبارات میں شائع ہوتے رہیں اور جس کا تذکرہ زبانوں میں حلاوت اور جس کا نظارہ آنکھوں میں تراوت پیدا کرتا رہی۔ بہترین عورت وہ نہیں جو شوہر کی بہترین مونس و تمسار ہو، بلکہ وہ ہی جس کی زندہ دلی، جس کی زرمزہ سنجی، جس کی نفاست و شائستگی اور جس کی رعنائی و دلربائی کے نقوش ہر کلب کے در و دیوار، ہر پارک کے سبزہ زار، اور ہر ہوٹل کے فریچر پر ثبت ہوں۔

”ہمارے“ اور ”ان کے“ اس فرق تخیل کو اقلیم الفاظ و معانی کا یہ تابدار صرف دو لفظوں میں جن جامعیت جس صداقت اور جس بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے یہ اسی کا حصّہ تھا۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہی شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی ”چمکی“ میں جو بلاغت ہی اس کا لطف اردو کا زبان دان ہی لے سکتا ہے۔ یہ چمک مخصوص نئی روشنی فضاں ہی۔ پُرانے چراغوں کی روشنی میں چمک دمک کہاں۔ شرم و حیا کا دور ہونا، اکتساب ہند دنیا کی ولستانی کی غرض سے کرنا، اپنے ٹیکس فیشن کے سانچہ میں ڈھالنا، یہ سارا مفہوم اور اس سے بہت کچھ زائد ”چمکی“ کے لفظ اور ادا ہو جاتا ہے اور شمع انجمن، ”چراغ خانہ“ کی تشبیہات تو اس قدر چست ہیں کہ ان سے روشن تر تشبیہ خیال میں بھی نہیں آتی۔

ہم اب تاکُن کی کم سخی و بے زبانی پر مفتوں تھے اور اپنی خانہ آبادی کی تنائیں تھے اب جو جا کر دیکھتے ہیں تو ماں مغل طرازی و بزم نوازی کے مٹاٹھ جم رہے ہیں اور گلے بازی کی مشق ہو رہی ہے ہم پر اس کا پلٹ عبرت، حسرت و حیرت کے مشترک جذبات طاری ہوتے ہیں اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ یا الہی یہ کیسی قلب ماہیت ہو گئی، کل تک ہم جسے نقش تصویر سمجھ رہے تھے، وہ آج گراموفون بنا ہوا ہے۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپرچ کا شوق

شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں بُت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ کی بلاغت پر دفتر کے دفتر زبان ہیں۔ تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ یہ تغیر جو کچھ

ہو ہی تغیر ماحول کا نتیجہ ہے۔ جب مادیت، ظاہر پرستی اور نمود و نمائش سے ساری فضا مملو ہو گئی، ۲۰ مردوں کی نظریں آسائش پر آرائش، راحت پر لذت، اور تسکین پر ہیجان مقدم ہو گیا تو عورتوں کے لئے بھی سوا اس چارہ نہ رہا، کہ وہ بھی زمانہ کا ساتھ دیں۔

ایک اور مقام پر مشرق و مغرب کے تخیل عزت نوانی کے فرق کو، جو نظام تعلیم کے بدل جانے سے لازمی طور پر پیدا ہو گیا ہے۔ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۵

اعزاز بڑھ گیا ہے، آرام گھٹ گیا ہے خدمت میں ہے وہ لیسٹری اور ناچو گریڈی

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر شوہر پرست بیوی، پبلک پینڈ لیٹی

اسلام نے پردہ کے بارہ میں جو انتہائی سختی برتی ہے۔ اس کی بنیاد نفس بشری کی انتہائی کمزوری پر ہے جو گروہ نکاح کو ایک بے معنی رسم قرار دیتا ہے اس کی جانب دوسری جن نہیں، لیکن جن رگوں میں ابھی مشرقی خون دھڑ رہا ہے اور جو لوگ بلا واسطہ نکاح تعلق ازدواجی کے ایک عمل شیطانی ہونے کے قائل ہیں ان سے عرض ہے کہ انسان کسی وقت بھی اپنے نفس کی جانب سے مطمئن نہیں ہو سکتا، بڑے بڑے پاکباز مرد و عورت کبھی بہ حالت تنہی ملنے جلنے میں یہ خطرہ پوری طور پر باقی رہتا ہے کہ ممکن ہے جذبات حیوانی دفعۃً ہیجان میں آجائیں۔ شریعت اسلام نے نفس بشری کی اس نفسیاتی (سائیکالاجیکل) حقیقت کو ملحوظ رکھ کر محض زنا کاری کو حرام نہیں قرار دیا ہے بلکہ ان حالات و اسباب کو بھی ناجائز قرار دیا ہے جو اس نتیجہ کی جانب لے جانے میں معین ہوتے ہیں۔ کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانَا۔ محض اتنا نہیں کہ زنا کاری نہ کرو بلکہ یہ کہ زنا کاری کے قریب نہ جاؤ۔ پرو کا رواج جو مسلمانوں میں پڑا۔ اس کی بنیاد اسی حکیمانہ مصلحت پر ہے۔ ایک اور موقع پر کلام پاک میں بھیضہ اور مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم ملتا ہے کہ ”اپنی اپنی نظریں نیچی رکھیں“ یہ ساری احتیاطیں اور قیدی اس واسطہ ہیں کہ بدکاری کے جتنے راستہ ہیں سب مسدود ہو جائیں۔ مغرب نے اس سیلاب کو تعلیم کے بندے روکنا چاہا۔ اس میں اس کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ ہر مجرم اسرار پر ظاہر ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا شیطان کو جو شے دور رکھنے والی ہے وہ نور ایمان ہے، نہ کہ کتابوں کے انبار، رسائل اخبار اور کالجوں کے در و دیوار

جن کے مجموعہ پر آج تعلیم کا اطلاق ہوتا ہے۔ اکبر اس کیفیت کی نقاشی ان الفاظ میں کرتے ہیں: برادران کالج
 ذرا جارج ایلیٹ کی دماغی عظمت اور لوئیس واپسنر کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو ایک بار
 پیش نظر کر لیں ۛ

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ علمی مباحثے ہوں ذرا پاس کے لیٹ
 دونوں نے پاس کر لیں ہیں سخت انتہا ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگیا
 بولی یہ سچ ہے علم بڑھا جہل گھٹ گیا لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

یہ سب کچھ سچ ہے، مگر پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ پردہ کے احکام تو مسلمان عورت کے لئے ہیں، جب سرے
 سے اسلام ہی غائب ہے تو پردہ کی پابندی کیسی اور بے پرزگی میں مضائقہ کیا؟ پردہ تو بقائے ناموس و
 لفظ ایمان کی غرض سے ہے جب ناموس و ایمان غما ہیں تو ان کے تحفظ کی تدابیر بے معنی ہیں۔ خورد و
 زندہ جسم کی ضروریات کے لئے ہے، لیکن جب زندگی جسم سے مفارقت کر چکتی ہے تو مردہ جسم کو کوئی نہیں
 کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں بڑی بڑے مضبوط قفل اس وقت تک پڑے رہتے ہیں، جب تک اس میں زرو
 جواہر محفوظ ہیں، لیکن جب وہ خالی ہو جاتا ہے تو کوئی بھی اس کی حفاظت کی فکر نہیں کرتا۔ پھولوں کی تد
 اسی وقت تک ہے، جب تک ان میں نازکی و خوشبو باقی ہے، باسی اور خشک پھولوں کو کون گئے کا ہار بنانا
 پسند کرے گا؟

فرماتے ہیں ۛ

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید بے حجابی جو ہوا اس میں توقیاحت کیا ہے
 نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

عقبتی اودین کے خیال سے قطع نظر کیجئے محض مادی و دنیوی نقطہ نظر سے دیکھئے کہ مشرقی خواتین کو
 مغربی تعلیم دینے کا اب تک نتیجہ کیا نکلا ہے؟ لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھتے چلئے کہ خود ہمارے مردوں نے ٹکسیر
 ملٹن کی درستی گردانی اور مل واپسنر پر دماغ سوزی کر کے اب تک بجز چند نوکریوں کے اور کیا حاصل کیا؟
 جب ہی تو یارانِ طرقت کا کننا یہ ہے کہ ۛ

شیخ صاحب ہی کا ہی بزم میں کیا رعب و قار کہ خواتین کو پہلک میں ہو وقعت کی اہم
خیر مردوں کی تعلیم کا تذکرہ تو اصل موضوع سے دُور کر دے گا، عورتوں کی مغربی تعلیم کا نتیجہ اب تک تو یہی دیکھنے
میں آیا ہے کہ میم صاحبہ کے بچوں کے کھلانے کے لئے آیاؤں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کلیات اوّل میں
فرماتے ہیں ۷

ترقی کی تپیں ہم چپڑھائیں گھٹا کی دولت اسپیں بڑھائیں
رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبں وہ گوا سکول میں برسوں ٹھاکیں
کلیات سوم میں اس موقع کو زیادہ آب و رنگ دے کر پیش کرتے ہیں ۷

اک پیر نے تہذیب لڑکے کو ابھارا اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو ستھارا

کچھ جڑ توان میں کے ہو یاں میں قصاں باقی جو تھے گھران کا تھا افلاس کا مارا
ہزارہ بنا کمپ میں یہ بن گئیں آیا بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا
دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ آغاز سے بدتر ہے سرا بنجام ہمارا

عجلت پسند طبائع یہ نتیجہ نہ نکال بیٹھیں کہ اکبر مرے سے تعلیم نوانی کے مخالف تھے اور لڑکیوں کے
بالکل ہی ناخواندہ و جاہل رکھنے کے حامی تھے۔ وہ تعلیم نواں کے پورے ہمدرد تھے، لیکن اُس تعلیم کے جو قوم میں
راجعہ بصریہ و جہاں آرا بیگم کے نمونہ پیدا کرے، نہ اُس تعلیم کے جس کو کلکٹ، کلیو پٹیا، میڈم ڈی ایٹیل، ماڈالین
و جارج ایلیٹ پر فخر ہو۔ وہ اُس تعلیم کی ترویج کے آرزو مند تھے جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت
شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ اُس تعلیم کو جو تھیسٹری، ایکٹری اور برہنہ رقاصی کے کمالات کی جانب لے جائے۔ وہ

لے یہ مفروضات و تخیلات نہیں، واقعات و مشاہدات ہیں سلسلہ میں سس ماڈالین صاحبہ ہندوستان تشریف لائی تھیں، جن کا نام یورپ و امریکہ
میں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور ہندوستان کے انگریزی اخبارات کے کالم ان کے کارناموں سے لبریز ہوتے تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ نہایت باریک لباس
میں جو جسم کے صرف نصف حصہ کا سا ظہور تھا، اسٹیج پر تشریف لاتی تھیں، اور حالت رقص میں بالکل برہنہ ہو جاتی تھیں، لیکن جسم اس تیزی سے گردش
کرتا رہتا تھا کہ ناظرین کی نگاہ جسم کے کسی حصہ پر ٹھہر نہیں پاتی تھی راقم مضمون نے لکھنؤ کے انگریزی پتھ گھر (رنگ تھیٹر) میں یہ تماشہ اپنی آنکھوں سے
دیکھا تھا۔ لکھنؤ کے متوقین تماشائی اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے دُور بیٹھیں لے لیکر گئے تھے!

ملک میں جو رہیں پیدا کرنا چاہتے تھے کہ دُنیا جنت بن جائے۔ پریوں کے مشاق نہ تھے کہ ہندوستان راجہ اندیکا
دربار بن جائے۔ ان کا قول تھا ہے

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو
اس مقصد کی مزید توضیح سنئے ۵

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم اُستاد ایسے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں
”اُستاد جی“ ارباب نشاط کے تعلیم دینے والوں کو کہتے ہیں،

ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک و ضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے (صفحہ ۱۶۰ تا صفحہ ۱۶۲) چند شعروں سے
اندازہ ہو سکے گا ۵

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حسن معاشرت میں سراسر فرقہ ہے اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت جس سے برادری میں بڑھتی قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تنگت ہو وہ طریق جس میں ہونیکی و مصلحت
ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ شوہر کی ہو مُرید تو بچوں کی خادمہ
عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کہے اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آگے چل کر حساب کتاب، نوشت و خواندہ، اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے، وغیرہ کو درس نسوانی

کا لازمی نصاب بتا کر آخر میں فرماتے ہیں ۵

داتا نے وطن دیا ہی تو دل سے غنی رہو پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں یوی بی بی ہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دُنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہو شان ہے ان کی طلب میں حرص ہیں، سارا جہان ہے
اکبر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے دُنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہی اس کا عمل خراب ”آج“ اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

فرماتے یہ سب کچھ تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ رفتار زمانہ کا رخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، فطرت ہر صورت میں اپنا کورس پورا کر کے رہتی ہے۔ انبیاء کرام جو محض ہدایت خلق کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔ عواماً، کام ہی رہا کئے۔ صرف ایک محدود جماعت ان پر ایمان لائی۔ باقی خوشحال و متہن آبادی ان کو سناہر یا مجنون (موجودہ اصطلاح میں Reactionary) سمجھ کر بدستور اپنے راستہ پر چلتی رہی، تا آنکہ عذاب الہی نے اس تمدن ہی کو اس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ فنا کر دیا، جس کی چشم دید مثال حال میں شنشاہیت روس کی معدومیت نے پیش کر دی ہے۔ حضرت اکبرؒ بھی اپنے مہن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بار بار اس کا اظہار فرمایا ہے۔

کلیات دوم میں ایک قطعہ میں آزادی نسواں کے مستقبل کا نہایت دلکش مرقع کھینچتے ہیں۔ اس میں فرماتے ہیں کہ ضبط نفس و تقویٰ و ایمان رکھنے والوں کا دُور ختم ہو چکا ہے، اب کالج کے نوجوانوں کا دُور دورہ ہے۔

اٹھ گئے وہ جنہیں مقدور تھا خود داری کا نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم نہ وہ دل کی مہد

دولہ لے کے بکھنے لگے کالج سے جواں شرم مشرق کے عدو شیوہ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈ ان کی مسجد ہے، اور تھیٹر حال ان کی عید گاہ ہے۔ اس تمدن کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ:۔

بحث میں آہی گیا فلسفہ شرم و حجاب دُور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تڑپ

عورتوں کو سیاسی حقوق مل گئے اور مردوں کے دوش بدوش وہ پبلک میں کام کرنے لگیں

زہرہ ممبر ہوئیں دوڑتھیں جناب خورشید

اکبر کے کچھ ہم خیال ابھی زندہ تھے۔ انہوں نے دُرتے دُرتے بھما کہ یہ کارروائی حالات زمانہ کے لحاظ سے

بھی کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی، لڑکوں کو مغربی تعلیم دلا کر کیا مفید نتائج نکلتے ہیں جواب لڑکیوں کو اس اوپر ڈالا جا رہا ہے

شیخ صاحب ہی کا ہی بزم میں کیا عجب وقتا کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی مہد

یہ کتنا تھا کہ روشن خیال و متہن دنیا بے صبری کے ساتھ چرخ اٹھی۔ ع

نعرے تحقیر کے اس پہنچا روں میں بلند

اور تو اور بن بیا ہی لڑکیاں تک جو ”دولہا بھائی“ کی روشن خیالیوں سے متاثر ہو چکی تھیں، مطالبہ حقوق کے لئے بیابان آگے بڑھیں اور رجز خوانی کی بجلیاں گرانے لگیں۔

لڑکیاں بول اُنھیں خود بہ طریق تائید

دولہا بھائی کی ہی یہ رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہی شدید

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہیں ہم یہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

ضعیف العقوی، ضعیف العقل، ضعیف الحواس شیخ صاحب اس حملہ کی تاب نہ لاسکے، بھاگ کر اپنے

حجرہ میں پناہ لی۔

اکبر آفسردہ شد از گرمیِ این طرز سخن شیخ بکرمخت و در صومعہ خویش خرید

جدید پارٹی کو فتح کامل نصیب ہوئی، تالیوں کا شور بلند ہوا، اور فرزندانِ آدم و دخترانِ حوا دونوں نے مل کر تنیتِ حصولِ آزادی کا ترانہ گایا۔

کھل گیا در نہ رہا شاہِ مشرق کو حجاب غل مچا ہرے کا بول اٹھے یہ مغرب کے خرید

بشّ الحمد ہر اک چہ کہ خاطر میں خواست آخر آمد ز پس پردہٴ تقدیر پدید

ایک قدیم غزل اسی سکہ حریت نسواں سے متعلق ہے۔

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بیبیاں کب تک بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

جو منہ دکھائی کی ہو رسم پر مصر ابلیس تو منہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک

مقطع میں انجام کی پیشینگوئی ہے۔

سنا ہی حضرت اکبر ہیں حاسمی پردہ لگروہ کب تک اور ان کی رباعیاں کتاب

عصمت و عفت، شرم و حجاب، چوں کہ مشرقی اخلاق و اسلامی تہذیب کا ممتاز و لطیف جوہر ہے، اس لئے

اس کی تائید و حمایت میں اکبر نے بہت زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن حریت نسواں کے علاوہ بھی تمدنِ جدید کے رتبے نمایاں مظاہر ہیں تقریباً ان سب پر انھوں نے کم و بیش توجہ کی ہے۔ عبرتِ پزیری اُن کے قلب کا اور

عبرت آموزی اُن کے قلم کا جو ہر ہی۔ اس ایک قوت کے سہارے ہر تختہ زمین میں نے نئے شگوفے کھلا دیے ہیں اور ہر ریگستان کو لالہ زار بناتے چلے گئے ہیں۔

آج کل کے کمیٹی ساز اور جلسہ باز حضرات طلب دنیا میں جس قدر منہمک اور روحانیت سے جس قدر بیگانہ و نامانوس ہیں اُس کا عکس اکبر کے جامِ جم میں دیکھنا ہے

جن میں ہر گام پہ اک دام بلا ہی درپیش نفس کو تو انھیں باتوں میں مزا آتا ہی
اس کمیٹی میں نہیں رُوح کی لذت کا خیال ممبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکرِ خدا آتا ہی

اس وقت خلوص کا نام بھی نہیں باقی رہا ہی، اتحاد کی بنیاد تمام تر خود غرضی رہ گئی ہے۔ انگریز اگر ایک زمانہ میں مسلمان رعایا کے ہمدرد تھے تو محض اس لئے کہ ان کی تائید حاصل کر کے ہندو رعایا کو زیادہ آسانی سے نقصان پہنچا سکیں، ہندو اور مسلمان اگر آج متحد نظر آ رہے ہیں تو اس لئے نہیں کہ اتحاد و اتفاق بذاتِ خود کوئی قابلِ قدر شے ہے، بلکہ محض اس لئے کہ دونوں مل کر انگریزوں کو زک پہنچائیں۔ روس و انگلستان کی رقابت ایک زمانہ میں ضربِ المثل تھی، دورانِ جنگ میں جرمنی کی قوت شکست کرنے پر دونوں دوست ہو گئے، اب پھر ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ جاپان کل تک روس کا دشمن تھا، آج امریکہ کے مقابلہ میں روس سے معاہدہ اتحاد کر رہا ہی۔ اٹلی کل ترکوں کے خون کا پیاسا تھا، آج انگلستان کی ضد پر اُس کا ساتھ دینے پر تلا ہوا ہے غرض تمدن جدید میں خالص دوستی ایک لفظ بے معنی رہ گیا ہی اغراض و مصالح کے تغیر کے ساتھ دوستی و دشمنی میں بھی ہر ساعت تغیر ہوتے رہنا ممکن ہی۔ اسلامی شاعر کو یہ منظر عبرت دیکھ کر اپنے ہاں کا بھولا ہوا اصول **اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالبغضُ لِلّٰہِ** یاد پڑ جاتا ہی اور اس کے منہ سے یہ نالہ موزوں نکلتا ہی ہے

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار جس کا تو حاسد ہے اُس کا جو ہو حاسدِ تیرا

واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا اب تو ہر اک ہی مجاور اک جسدِ ارگاہ کا

واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سود چند روزہ متفق ہوں ورنہ اے شیخ و ہندو

واسطے اللہ کے ہو دوستی وہ اب کہاں

۱۸۱۶ء میں کلہ گویان طرقت و مدعیان شریعت کے درمیان ایک سخت جنگ چھڑی۔ لاہور والے شریعت کے میدان میں مجاہدین کی حیثیت سے تکبیر کہتے ہوئے آئے۔ دہلی والے طرقت کی خانقاہ کو اپنا اسلحہ خانہ بنا کر نعرہ بلند کرنے لگے۔ اخباری شمشیر زنی ہوئی، رسالوں کی چاند ماری رہی یہاں تک کہ گورنمنٹ سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ مصالحت دشوار تھی، ایک فریق کو اپنی جسمانی تنہ زوری پر دعویٰ تھا، دوسرے کو اپنے داؤں پیچ پر۔ اکبر نے عین اُس وقت جب کہ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے مصلحتی و مصالحت جوئی کا دھارا کھول دیا۔ وہ آگ تو دیر یا سویر بجھنے والی تھی ہی۔ اب اس کی خاکستر بھی باقی نہیں البتہ چشمہ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے جو کبھی خشک ہونے والے نہیں۔ پوری نظم طویل ہے، اقتباس ملاحظہ ہو۔

اغیار کو ہو مردہ آپس میں چھپ گئی ہر	اس وقت مولویت صوفی سے بھڑ گئی ہر
صوفی کو یہ کہ دارم پائے چراغ پویم	ملا کو زعم ہے یہ دائم چہرہ گویم
صوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو	ملا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو
صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑیے	ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑیے
دیکھا نہیں تھا لیکن مردوں پہ آپریشن	کہتے ہیں کر رہی ہیں ہم یہ رفاہیشن
آپس میں گالیاں میں غیروں کی تالیاں یہ	اس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں یہ
بیسود جنگ یا ہم ہے سخت بوقوفی	شیعہ ہوں خواہ سنی، ملا ہوں خواہ صوفی
موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہر	دیکھو زرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے
اللہ کو پکارو اللہ کو پکارو	وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو

سب کے گمراہ نام لفظ ”ترقی“ میں مضمر ہے۔ مغرب کے معائب ہم جو کچھ بھی اختیار کرتے جاتے ہیں اگر انھیں معائب سمجھ لیں تو پھر ان سے بچنے کی بھی کوئی صورت نکال سکتے ہیں لیکن ستم یہ ہر کہ انھیں بجائے معائب کے مناقب، بجائے نقائص کے کمالات، بجائے زہر کے تریاق سمجھ رہے ہیں ”ترقی“ ”تہذیب“ ”دشایستگی“

”ارتقاء“ ”روشن خیالی“ وغیرہ چند الفاظ شیطان کان میں پھونک گیا ہی اور ہم بغیر ان کے مفہوم پر غور کے اندھا دھند ان کی تحصیل و تکمیل میں مصروف ہیں شیطان کی ذہانت کی داد دینی چاہیے، کہ اس نے شکار کرنے کی ترکیب خوب نکالی ہے

شیطان نے ترکیب تنزل یہ نکالی ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو
شیر کا شکار کرنا جب مقصود ہوتا ہی۔ تو درختوں میں بھینسے باندھ جاتے ہیں۔ شیر ان کی بو پا کر انھیں نشانہ کرنے آتا ہی اور بجائے اس کے خود ہی لقمہ اجل ہو جاتا ہی۔ شاعر اس تشبیہ کو بھی کام میں لاتا ہی ہے
شیر ان شوق کا انھیں منظور ہی شکار بھینسے بندھ ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

توسیع حقوق سیاسی پر ہم مسرور ہیں کہ اپنے نمایندہ دل کا حق انتخاب مل جانے سے ہماری آزادی میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں غور کرتے کہ اس طرز انتخاب نے ہماری جماعت میں باہمی رشک و حسد، بدگمانی و نفست خود غرضی و نا اتفاقی کو کتنا بڑھا دیا ہی اور نا جائز ترفیبات کا دامن ہمارے نفس کے لئے کتنا وسیع کر دیا ہی۔ عذراُخروی سے اگر انکار ہی تو رہنے دیجئے، مگر خدا را یہ تو دیکھئے کہ اس طرز تمدن سے عذاب دینی کیسا ہمارے سرو پر مسلط ہو گیا ہی ہے

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہی خدا کی مار ہے و دوٹوں کی مار کم کیا ہی
اسی راگ کو ایک دوسری دُمن میں سُنئے ہے
قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ سمجھیں ہیں اس کو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہا ہتا پائی سیلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر کی ووٹ کی دُمن میں بن گئے پھر کی

موجودہ نظام تمدن کا یہ طبعی اقتضا ہے کہ انسان حقوق والدین، حقوق بزرگان، حقوق خالق، سب سے

بیگانہ ہو ہے

باپ ماں سے شیخ مسیحا اللہ سے کیا ان کو کام ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

شعر کے مضمون کو مبالغہ شاعری نہ سمجھنا چشمِ عبرت اپنے گرد و پیش بارہا اس قسم کے مناظر دیکھ رہی ہے۔ آخرت کے خیال سے قطع نظر کیجئے۔ یہ فرمایے کہ تہذیب جدید نے زیست کی سہولتوں پر کیا اثر ڈالا ہے؟ جنگ و ہلاکت و سفاکی کے وہ میجر العقول آلات و وسائل کس نے ایجاد کئے ہیں جن تک جنگیگز و ہلاکو کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا؟ موٹروں، ریلوے ٹرینوں، ٹراموے وغیرہ کے ذریعہ سے اموات ناگمانی کا ماہا اوسط ہر تمدن ملک میں کتنا بڑھ گیا ہے؟ ضروریات زندگی کی اس فوق الحد گرائی کی کوئی مثال کچھلی تاریخ میں ملتی ہے؟ ملوں کی کثرت، کارخانوں کی افراط اور ہر شعبہ میں بجائے قدرتی کے مصنوعی طرز معاشرت اختیار کر لینے سے بڑے بڑے تمدن شہروں کی صحت کا کیا حال ہو گیا ہے؟ تمدن آبادیوں میں فی صدی کتنی تنہا گرو دانت اور آنکھیں تندرستی کی حالت میں ہیں؟ جو سکون، اطمینان و انبساط خاطر بیگانہ تمدن، دیہاتیوں کو حاصل رہتا ہے، اس کا عشرِ عشر بھی تمدن جدید کے پُر آشوب ہنگامہ پرورد و ہیجان آفریں مرکروں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے؟ اس قسم کے بیسیوں اور سوالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کو اکبر کی ترجمان حقیقت زبان ان الفاظ میں ادا کرتی ہے۔

تہذیبِ نوجسے تم کہتے ہو اس سے اکبر دُنیا بگرد رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گزر رہی ہے
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردد کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

سنتے آئے ہیں کہ ہر درد کی دوا علم ہے۔ خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے۔ محملج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے۔ بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے۔ ایسا ہوتا ہوگا، لیکن ہم اپنے نصیب کو کیا لکھ روئیں کہ ہمارے لئے یہی تریاق زہر ہے۔ ہمیں جس علم سے سابقہ پڑا ہے، وہی ہمارے امراض کا مورث، ہمارے مفاسد کی اصل اور ہماری بد بختیوں کا منبع ہے۔ ہم جسے شربت سمجھ رہے ہیں، وہ جامِ زہر ہے، جسے رہبر سے موسوم کر رہے ہیں وہ رہزن ہے جس پر سیج ہونے کا گمان کر رہے ہیں وہ فرشتہ اجل ہے، جس نظام کو ہم نے علم و تعلیم کا نام دے رکھا ہے، حقیقت وہ مین بھالت ہے جس حکمت و دانائی کی ہم قصیدہ خوانی کر رہے ہیں وہ بیدانسی و جہل کی انتہا ہے۔ جس شے کو ہم نور و ہدایت خیال کر کے خوش ہو رہے ہیں، وہ ظلمت و ضلالت کی آخری حد ہے۔ یہ وہی علم ہے جس کا مقصود

ہمارے دلوں میں حُب دینا کو مستحکم کرتا ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے جس کے نصاب میں خیالِ عقبیٰ و آخرت کے لئے کوئی جگہ نہیں، یہ وہی فلسفہ ہے جو خدا و رسول کے اعتقاد سے نا آشنا ہے، یہ وہی سائنس ہے جو مادیات کے ماوراء کسی عالم کا قایل نہیں۔ یہ وہی حکمت ہے جس کے ہاں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود اوہام سے زائد کوئی مرتبہ نہیں رکھتا۔ اس نظامِ تعلیم کے جو نتائج ہونا تھے وہ ہو کر رہی۔ جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے موئد ہیں اور پھر اس کے لازمی نتائج پر چسپ ہیں، اس خیال میں لگے ہوئے ہیں کہ آگ تو پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو، پانی موجود ہو جائے، لیکن کسی شے کو تر نہ کر سکے، آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے متور نہ ہونے پائے۔ اکبر کی تشخیص میں ہمارے انحطاطِ اخلاق، سوء معاشرت کا سبب و حید یہی مسموم نظامِ تعلیم ہے۔

اک علم تو ہے بُت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
 جب علم ہی عاشقِ دنیا ہو پھر کون بتائے راہِ خدا
 اس علم کی سب دیتے ہیں سند۔ اس علم میں ماہر کون کسے
 جب خضرِ اقامت پر ہوں فدا، تا یہ مسافر کون کسے
 سودا بھی ہے رنگِ طبع بشرِ فطرت ہی میں ہیں اسبابِ جو
 اکبر کو بھی ہوش آجائے تو پھر اس کام کو آخر کون کسے
 ایک دوسرے مقام پر حقیقت اور بھی واضح کر دی ہے۔

مسترِ نقلیٰ کو عقبتے میں سزا کیسی ملی
 شرح اس کی نامناسب ہے ملی جیسی ملی
 اس نے بھی لیکن ادب کر دیا یہ التماس
 چارہ کیا تھا لے خدا تعلیم ہے ایسی ملی

ایک اور جگہ ایک جدید اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔

اُس چیز کا کیا کہنا اکبر، تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
 لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا، ہموار کیا اور ایک کیا
 جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب اُن اثروں پر رونا ہے
 معلوم نہیں کیا مطلب ہے، معلوم نہیں کیا ہونا ہے

اس کا بوجب ہے سن لو اُسے سب پر وہ عیاں ہے ظاہر ہے
 الفاظ صریح و واضح ہیں، یہ مطبع اکبر حاضر ہے
 تعلیم جو دی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
 جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے
 قوم کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علی گڑھ، پیشاور، لاہور و الودہ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتی ملازمت

کے سکون کی ٹکسائیں بیشک یہاں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن ”قوم“ جس شے سے عبارت ہے، اس کا قوام تو دیوبند فرنگی تحمل، نظامیہ و عالیہ ہی میں ان کی موجودہ خامیوں کو دور کرنے کے بعد تیار ہو سکتا ہے۔ اس خوان کو ظرفیت کے چٹخارہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۷

یہ بات تو کھری ہی ہرگز نہیں ہی کھوٹی عربی میں نظم ملت، بی اے میں صرف دہائی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے بندھو ایں گے یہ حضرت اس قوم کو ننگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے کس کی نظر ہی فارکس کی نظر ہے موٹی

لیکن ”نظم ملت“ کی اب پردہائی کس کو ہے۔ یہ تخیل کہ قوم میں اب دوبارہ (سلمان و بلال کا ذکر نہیں، غزالی و رازمی، مالک و ابو حنیفہ، سعدی و درومی پیدا ہوں، ممکن ہے کسی زبان پر اب بھی آجاتا ہو، لیکن دلوں سے مدت ہوئی مٹ چکا ہے۔ اب توبہ کی آنکھیں اس پر لگی ہوئی ہیں، کہ ہمارے ہاں بھی پنوئیں، دلیں، بسا رک و گلیڈ اسٹن، روک فیلر و کاربنیگی پیدا ہونے لگیں۔ خودی کی پرستش سے کس کو فرصت ہے، جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر بھی منظر دیکھ کر صدمہ لگاتا ہے ۷

مذہب بے پکار اے اکبر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
کائنات میں مادیت و تخلیف کا وجود اس غرض سے رکھا گیا ہے کہ اس سے نفس میں شکتگی و تضرع پیدا ہو
اور اس وقت مخلوق اپنے ہمجنسوں سے بے آس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے
اسلام میں عذاب الہی کا یہ فلسفہ تصریح و تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ اے پیغمبر تمہارے قبل جو قومیں گزر چکی ہیں ان کی طرف بھی ہم نے پیغمبر
فَاَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَآءِ لَعَلَّهُمْ بھیجتے تھے اور ان قوموں کو بھی عذاب و سختی میں مبتلا کیا تھا، تاکہ وہ ہمارے
يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (الفرقان: ۵)

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ نَّبِيٍّ إِلَّا آخَذْنَا جس سببی میں ہم نے اپنا پیغمبر بھیجا (اور اس نے اس کا کمانہ مانا تو) وہاں کے
بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (اعراف: ۱۳)

باشنہدیں پر ہم نے عذاب و مصیبت کو مسلط کیا تاکہ وہ لوگ گڑ گڑائیں۔

فطرتِ سلیم ایسے موقع پر راہ ہدایت پا جاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جس کی شقاوت و فساد اس حد تک پہنچ چکی ہوتی ہے کہ اس کے لئے یہ تمام تازیانہ بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان ہر جدید آئیہ ہر تہنیہ فطرت اس کی غفلت و جمود، الحاد و جحود میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ ان کی شامت اعمال کے پاداش میں ہر تریاق ان کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ کلام اقدس میں اس طبقہ انسانی کا کثرت سے ذکر آیا ہے، خلا

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طَعْنًا وَكُفْرًا (مدہ - ۹)

یہ قرآن جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، ضرور ان میں سے بہتروں کی بد اعمالیوں کے پاداش میں ان کی (کی سرکشی و کفر میں زیادتی کا باعث ہو کر رہیگا۔

یہ کہ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمُ الْكِنَّةَ أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَإِنْ يَرَوْا كَلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا

لے پیران میں ایسے بھی ہیں کہ تمہاری باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں، لیکن ہم (ان کی ہمتی اعمال کے پاداش میں) ان کے دلوں پر پڑے ڈال دئے ہیں اور ان کے کان میں ٹھنٹ، کہ تمہاری بات نہ سمجھ سکیں۔ اور یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ ساری دنیا کی بھی نشانیاں دیکھ لیں تاہم ایمان لانے والے نہیں۔

یہ کہ

وَمَا تَغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ (یونس - ۱)

جو لوگ ایمان لانے والے نہیں، ان کے لئے نشانیاں اور ڈراؤنیاں سب بیکار ہیں۔

اس بد بخت و حرام نصیب طبقہ کی شناخت یہ ہے کہ ہجوم مصائب میں بھی اسے مادی اسباب پر تکیہ اور دنیوی وسایل پر بھروسہ رہتا ہے، اور تضرع و تبتل کی کیفیت ایسی حالت میں بھی ناآشہار ہوتا ہے، فاقہ کشی کے وقت و مامند اجبتہ فی الاہم علی اللہ ہر دھماکا وعدہ یاد نہیں پڑتا۔ دست سوال زریں کلاہوں کے سامنے دراز رہتا ہے اور پائے طلب بلند و عالی شان دفتروں کے گرد طواف کرنے میں خستہ ہوتا رہتا ہے۔ اشتداد مرض میں سورہہ یسین کی تلاوت کا خیال نہیں آتا۔ نگاہ تھرمائیٹر کے آتا چڑھا ڈال اور ہسپتال کی شیشوں پر جمی رہتی ہے۔ مرتے وقت اس کی فکر نہیں ہوتی کہ پرسش اعمال کی نازک گھڑی کیوں کر ٹل سکے گی خط یہ

سوار رہتا ہی کہ تاریخ وفات کن کن اخبارات میں شائع ہوگی۔ اکبر کی زبان حقیقت ترجمان اس منظر میں نوحہ خوانی کرنی ہے، لیکن جانتے ہیں کہ یاران مجلس مرثیہ خوانی و عزاداری کے نام سے گریز کرتے ہیں، بزم میں اس شان سے قدم رکھتے ہیں کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے، ہاتھ اور پیر تھرنے میں مصروف ہیں نشاط و زندہ دلی کا سا نہ ہوا ہے، لیکن منہ سے درود و جبرت کی صدائیں نکل رہی ہیں اور زیر لب سوز و غماں کے سُروں میں آواز آرہی ہی۔ بزم میں تماشائی زیادہ ہیں، اہل نظر چند تماشائی یہ سوانگ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں اور اہل نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں یہ منظر ملاحظہ ہو۔

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسمان نکلیں میان مسجد سے نکلی اور حرم سے بیویاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو دُعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

ستم یہ ہے کہ دن کو دن اور رات کو رات کہنا بھی ناممکن ہو گیا ہی، تا آن کہ انسان اس جرم کے پاداش میں اپنے تئیں دار و رس کے لئے نہ سہی، زنجیر زنداں کے لئے تیار نہ کر لے۔ حق گوئی ہمیشہ دشوار رہی ہے موجودہ فضائیں دشوار تر ہو گئی ہے۔ زندگی اگر آرام و عزت سے گزارنا ہی، تو اس حتم میں برہنہ ہو کر ڈھل ہونا چاہیے، اسی رنگ میں خود بھی رنگ جانا چاہیے اور حق و دیانت کے خیال کو پس پشت ڈال دینا چاہیے۔ یہ عجب عمل، یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش بھرے گئے جو پلے بت تو بچے رہے، جو کھری کی تو دھری گئے تری بزم اکبر خوش بیاں ہے محل فرحت و دشتاں جو ملول آئے وہ خوش گئے جو فسر دہ آئے ہر گئے

اس وقت توحیت جاہ طلب دنیا، و حرص مال و زر کا جن ہر سر پر سوار ہے، روحانیت الگ ہی عقلی و ادبی اخلاقی مباحث پر بھی توجہ کرنے کی کس کو فرصت ہی۔ غزالی و رومی تو الگ رہے، فردوسی و غالب، فارابی و طوسی کی تصانیف بھی ہم پر بار ہو رہی ہیں کہ ان کا مطالعہ جلب زیریں ہمیں زرا بھی معین نہیں معلوم ہوتا ہے

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا

بہر خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع صاحب کا کیا جواب تھا، بابو نے کیا کہا

دنیا میں نزاع و اختلاف کا سلسلہ شروع سے قائم ہی، لیکن پہلے جنگ و جدال کی بنیاد مومنوں پاس عزت، حفظ

نہ اہل معنی کو ہے لازم سخن آرای بھی بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی (معالی)

ناموس و تحفظ عطا نہ ہوتی تھی کہ یہ سب چیزیں خود داری کے پہلو کو لئے ہوئے ہیں، لیکن اب زرپرستی طابع پر اس درجہ غالب آگئی ہے کہ خصوصیتوں کی بنیاد بھی تقریباً صرف یہی باقی رہ گئی ہے۔ تجارتی رقابت معاشی مابقت نے ہر شعیہ حیات کو گھیر رکھا ہے۔ فرماتے ہیں ۷

مذہب کے واسطے نہ شرافت کو واسطے
ہی اب توجنگ حکم و تجارت کے واسطے
لے ہی گئے گھسیٹ کے جھکوپریڈ پر
تیار ہو رہا تھا میں حنبت کے واسطے

منافقت و دھاندلی کا دور دورہ ہے۔ قوم، قوم کے جو نعرہ لگائے جاتے ہیں، اکثر یہ چوب حسب جاہ ہی کے طبل ہی پر بڑتی ہے۔ مقصود تمام کارروائیوں سے نمود و نمائش ہی ہوتی ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس اُدھر ہمیں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ راہِ خدا میں جو کچھ خرچ کرو، اس کو اس قدر اخفاء کے ساتھ کرو کہ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے کو خبر نہ ہو۔ اور جو کچھ بھی خیرات کرو، خالصتہ وجہ اللہ کرو، احسان رکھنے اور حق بتلانے کا خیال تک دل میں نہ آئے ورنہ سب کیا دھرا اکارت ہوگا، بلکہ نرمی کے ساتھ انکار معذرت کر دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بعد کو اپنا حق بتلایا جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ
وَالْأَذَى (بقرہ ۲۶۶)

قول معروف و مغفیرہ خیر مِّنْ صَدَقَةٍ يَّبْتَغِيهَا
أَذَى (بقرہ ۳۶)

لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہے اور اس کا اعلان پہلے کیا جاتا ہے، پلیٹ فارم پر بھی اور اخبارات کے ذریعہ سے بھی، بلکہ اکثر صورتوں میں تو اعلان ہی اعلان رہتا ہے ادائی کی نوبت بھی نہیں آتی اور پھر اس کا خیر سے مقصود کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ فلاں انجمن کی صدارت مل جائے، فلاں کمیٹی کا کوئی عہدہ مل جائے فلاں جماعت پر اپنا ایک حق و اثر قائم ہو جائے، یا پھر یہ کہ چندہ کو کسی خطاب کی قیمت سمجھ لی جائے۔ شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر ہست و یاس کی لے میں پکار اٹھتا ہے ۷

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کے لئے
جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

ایک دوسری جگہ عبرت و حسرت کے اس گنجینہ کو شوخی ظرافت کے دو شالہ میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے۔
 چرخ نے پیش کشن کہہ دیا اٹھ ساریں قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخباریں
 شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مریدا وارہیں بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں
 انتشار ملت کی اس سے صحیح تر تصویر اور کیا ہو سکتی ہے۔

حمایت مذہب کے دعوے آج بھی بہت کچھ کہے جاتے ہیں لیکن معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ فلاں فریق کی مخالفت میں ہم اس خیال کی حمایت کر رہے ہیں، نہ یہ کہ فی الواقع ہم اس خیال کے ماننے والے ہیں۔ زید اپنے تئیں صوفی کہتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اشتغال واذکار صوفیہ کرام پر عامل ہے۔ بلکہ صرف اس قدر کہ بکر کے غیر صوفیانہ عقاید پر ممد کرتا رہتا ہے، اخبارات میں اس کی ذات کے خلاف مضامین لکھتا ہے اور ہر طرح اس کو توہین و قدیس کے درپے رہتا ہے۔ اسی طرح بکر اپنے تئیں خالص شریعت کا متبع بتاتا ہے، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ سنت نبویؐ پر عامل ہے بلکہ صرف یہ کہ زید پر طنز و تعریض کرتا ہے، اسے بدعتی قرار دے اور اس کے ساتھ دشمنی کا کوئی درجہ اٹھانہ رکھے۔ اکبر کا قلم اس سادہ تصویر کو بلاغت کے رنگین نقوش کے اضافہ کے ساتھ یوں پیش کرتا ہے۔

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے ہاں اُس کے ہی لٹھ تان کے مذہب نے ہمیں پہچان لیا، ہم اس کو نہیں پہچان سکے
 اس خدا فراموش تمام معیشت اور اس خود پرست آئین معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا، اور
 صرف یہ کہ دلوں سے میل ملاپ کی خواہش آٹھ گئی، دُنیا سے صلح و سازگاری رخصت ہو گئی۔ امن و عافیت کا
 نشان نہ رہا، انبساط قلب و سکون خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے، نظامِ مواصلات و آئین ہمدردی کے بجائے
 تنازع و لبقا، دوکارزار، حیات کا فلسفہ رائج ہو گیا، ضروریات زندگی گراں ہوئیں بدکاریاں ارزاں ہوئیں
 ہلاکتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں مٹی، اطمینان میں کمی آئی۔ محبتیں مٹیں، خصومتیں اٹھیں۔ خدا فراموشی کا
 یہ نتیجہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے، یہ خبر صدیوں پیشتر دیدی گئی تھی کہ

مَنْ أَحْضَنَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (طہ ۷) جو ہماری یاد سے روگرداں رہے گا اس پر زندگی تنگ ہو کر رہے گی۔
 ”متمدن“ طرز معاشرت سے عبقی جیسی سنورتی ہے اس کا حال تو بعد کو معلوم ہوگا، لیکن یہ تو مشاہدہ ہے کہ

دنیا بھی برباد ہو جاتی ہے۔ فطرت کا یہ پیام روز ازل سے ایسے لوگوں کے لئے موجود ہی کہ
 فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكُ مِنْكُمْ إِلَّا
 تم میں سے جو لوگ ایسا کریں۔ اُن کا بدلہ سوا اس کے اور کیا
 خُذِي فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (بقرہ ۱۰)
 ہو سکتا ہے کہ ان کی دنیا خراب ہو اور۔۔۔

یہ طریق معیشت، یہ فلسفہ اخلاق دین و دنیا دونوں کو برباد کر کے رہتا ہے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (نور ۱۲) ایوں کے لئے دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی عذاب شدید ہے۔
 گلشن مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے۔ اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ

لیکن اپنے اوپر تو کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے۔ زبان پر مرثیہ ہی لب پر آہ ہے۔ آستین آنکھوں پر ہوا سے
 ہٹا کر دیکھئے تو کچھ بوئیں حکمتی ہونی نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے مستقبل کا جو ہری ان موتیوں کی کچھ قیمت لگا سکے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہی ہیں باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں

ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل گریں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

ملنے کے وہ لگ رہے ہیں جو کروٹوں میں ٹوٹیں بچے جو فطرتی تھے وہ اب اُدھر ٹر رہے ہیں

سطح زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو نظروں میں پھل جھڑی ہی کو پھول جھڑی ہیں

چلتی تو ہیں زبانیں اور پھرتے ہیں شکم بھی لیکن امید کیا ہو جب دل اُبڑ رہے ہیں

یہ زیورِ معانی کس کی کریں گے زینت لفظوں کے یہ نگینے کیوں آپ بڑھ رہے ہیں

آج ہر طرف سائنس کی ترقیوں کا شہرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ تو ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے

لیکن سائنس قطعیات و یقینیات کا ہادی ہے۔ اور سائنٹیفک آلات و اختراعات کا وجود تمدن جدید کا مخصوص

فیض ہے۔ لیکن اول تو مسائل سائنس کی قطعیت کا دعویٰ ہی سترتا سر بے بنیاد ہے۔ کوئی اہم سائنٹیفک مسئلہ ایسا

نہیں جس پر شدید اختلاف آرا موجود نہ ہو۔ پھر دیکھنے کی بات یہ کہ یہ آلات و اختراعات اب تک دنیا کے

کے لئے باعث برکت ثابت ہوئے ہیں یا موجب لعنت؟ ان سے مجموعاً اب تک دنیا کے ذخیرہ سرت و ست

میں اضافہ ہوا ہے یا حوادثِ قتل و غارت، جنگ و جدال، بھارت و ہلاکت میں؟ ان سے انسان کے جذبات

ملکوتی کو زیادہ تحریک و تقویت پہنچی ہے یا جذبات بھیسی کو؟ ان سوالات کے جوابات کے لئے دو متقدم

”غیر متدن“ کی زندگیوں کا موازنہ کافی ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں۔ آہ ہمدرد کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ اپنا اخلاق، اپنا ایمان، اپنا جوہر شرافت، سب ہم نے آپ کی خوشنودی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو محض آپ کی خاطر بیگانہ کر لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے مصائب میں اضافہ ہی ہو رہا ہے، اور اخلاقی پلہ روز بروز ہلکا ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

مری عمل سے بیشع خوش ہیں بھائی خوش ہیں باپ خوش ہیں مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں جو دیکھا سائیں کا یہ چکر دھرم بچا رکھ اے برادر ہمارے دور میں پُن گن تھی، تمہاری دوری میں باپ خوش ہیں ”ہمارا“ ”اُن کا“ مشرق و مغرب کا یہ جو اختلاف ہے، جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے، فروع میں نہیں، اصول میں ہے۔ عوارض میں نہیں، ذوات میں ہے۔ بخت و اتفاق سے نہیں، جبلت و سرشت میں ہے۔ وہ مادیات میں مست ہیں، ہم روحانیات میں غرق۔ وہ ذہانت و تیز رفتاری، لذت و ناموری کے بھوکے ہیں، ہم سنجیدگی و سلامت روی، راحت و گمنامی کے قدردان ہیں۔ وہ تجارت و ثروت کی گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں، ہم فقر و استغنا کے حجرہ میں معتکف ہیں۔ ان پر حصول ممالک و خزائن کی دُھن سوار ہے، ہم تنہا قلوب و نفوس کے عمل میں مشغول ہیں۔ وہ دنیا ہے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم خود اپنے نفس سے ہیں۔ اپنے کو بلبس و نیوٹن، کو پرنیکس و گلیلو، ڈی کارٹ و کینٹ پرنا زہی۔ ہمیں اپنے کرشن و گوتم بدھ، نانک و کبیر، حضرت صدیق و حضرت امیرؑ پر فخر ہے۔ وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ انتہائے عقل و تحقیق میں یہ دریافت کر کے اُچھل پڑتے ہیں کہ ”انسان بند رہی“ ہم انتہائی بدستی و بیوشی میں پکارنے لگتے ہیں کہ ”انسان خدا ہے“ اکبر اس دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں۔

مشرقی کو ہے ذوق روحانی مغربی میں ہے میل جسمانی

کما منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولے بوز نہ ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مری اک دوست ”فکر ہر کس یہ قدر ہمت اوست“

اکبر محض واعظینہ تھے۔ حکیم اخلاق بھی تھے۔ راہ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جاتے

ولے نہ تھے، بلکہ اس رستہ کی پیچیدگیوں اور سفر کی دقتوں سے بھی واقف تھے، اس لئے آئندہ مسافروں کو ان چیزوں کی بابت بھی ہدایات دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مسائل یہ فایت پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، جذبات فطرت کی کشش ایک سمت ہوتی ہے، عاقبت اندیشی کا فتویٰ اس کے مخالف جانب ہوتا ہے۔ اگر نہ بجا ان گتھیوں کو بھی سلجھایا ہے۔ ان کے کلام میں متعدد مقدمات ایسے آتے ہیں، جہاں اخلاق و معاشرت کے جزئیات نہیں، بلکہ فلسفۂ اخلاق کے اصول کو بیان کیا ہے، اور مسائل اساسی کی عقدہ کشائی کی ہے۔

شباب کی بدستیاں بڑے احتیاطیاں جس غضب کی ہوتی ہیں، ہر شخص پر روشن ہیں۔ ساتھ ہی مذہب و اخلاق کے دارالافتاء سے ہر لغزش پر انتہائی تحریر کی وعید موجود ہے۔ اگر اس مسئلہ سے متعلق پہلے حکیمانہ اثر غماہی کے ساتھ انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، اور مرض کی ایک ایک علامت بیان کر جاتے ہیں، اُس کے بعد نسخہ شفا تجویز کرتے ہیں یہ تشخیص اور یہ علاج اس قدر مکمل ہے کہ اس میں ایک حرف کی ترمیم و اضافہ کی گنجائش نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

بہنچر کو ہونی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک پی شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
بہنچر کی طلب بالکل ہی بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہر دو شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوف خدا ہی اس کی خواہش
بہت سے لوگ مذہب سے متعلق واقفیت و معلومات محض اس لئے حاصل کر رکھتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے
ان کا اظہار کرتے رہیں، یا یہ کہ دوسروں کے افعال پر رائے زنی کرتے رہیں۔ خود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں
مقصود نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی زبانی واقفیت محض لا حاصل ہے۔ مذہب اخلاق سے فائدہ اُسی وقت حاصل
ہو سکتا ہے جب ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انہیں جزو زندگی بنا لیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے تذکرہ سے گرمی
محصل کا کام لیا جائے۔ لیکن عمل بغیر نفس کشی کے ممکن نہیں۔ نفس کو لذت تو صرف دوسروں کے بتانے میں
آتی ہے۔

علم دیں حاصل کیا، لیکن قباحت یہ ہوئی صرف سکھانے میں لذت ہی عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصراع بنے خود آہ سوناں تب ہی لطف ورنہ لے اگر تری نظم غزل میں کچھ نہیں
کسی مذہب کا نام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل نثر پاکیزگی اخلاق ہے۔ کفر و ایمان مذہبی اصطلاحیں ہیں جو اخلاق حسنہ

واخلاق سنیہ کے مُرادف ہیں جو پاک طینت ہیں وہ مومن ہیں، جو بد طینت ہیں، کافر ہیں۔
مرنے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت لوگ ہیں جن کی خالق سے نہیں ہی شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں
موجودہ زمانہ میں مذہب کی سوشل حیثیت بہت اہم ہو گئی ہے۔ ایک شخص عیسائی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیوں
سے میل جول رکھتا ہے، کھانے پینے رہنے سہنے کا طریق فرنگیوں کا سا رکھتا ہے، بڑے دن کے روز خوشی مناتا
ہے۔ اگر شیعہ ہے تو معنی یہ ہیں کہ مُحَرَّم میں مجلس کرتا ہے، ماتم میں شریک ہوتا ہے۔ تعزیہ رکھتا ہے، شیعہ سوسائٹی
میں گھلا ملتا رہتا ہے۔ اگر سنی ہے تو معنی یہ ہیں کہ محفل میلاد کرتا رہتا ہے۔ صوفیہ کرام کی عظمت رکھتا ہے، اہل سنت
کی تقریبات میں شریک رہتا ہے، اپنے گھر کی ریت رسم سنیوں کی سی رکھتا ہے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا
تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اور اپنے سوشل طریقوں میں تغیر کر دیا۔ نجات
ذکال اُخروی کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے، لیکن مذہب کی ظاہری ہیئت محض ایک معاشرتی
واخلاقی واقعہ ہے۔ اس لئے دنیا کو یہ دیکھنے کی بالکل حاجت نہیں کہ فلاں کے معتقدات کیا ہیں، بلکہ دیکھنا
صرف یہ چاہیے کہ اس کے اعمال و اخلاق کیسے ہیں۔

مذہب ہی امر قومی، سمجھو نہ فعل ذاتی معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا وفاقی
شیعہ ہوں خواہ سنی لالہ ہوں یا برہمن مذہب کو موروثوں سے سب پاتے ہیں عموماً
پولٹیکل ضرورت بیشک حتیٰ اس کی اوّل اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف شل
اچھا بُرا نہ کہہ دو تم مذہبی بنا پر اخلاق اس کے دیکھو اصلی تو یہ ہی جوہر
تعلیم ہی جو عمدہ صحت اگر ہے اچھی پاؤ گے اس کو اچھا طینت اگر ہی اچھی
ناری ہی یا کہ ناجی، اس کا بیاں نہیں ہے سوشل طریق یہ ہی اور وہ تو راز دیں ہی

قانون فطرت ایسا رکھا گیا ہے کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں۔ ایک شخص
تیار بازی میں ہزار ہا روپیہ ہار بیٹھتا ہے اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے لیکن جس شخص نے ہزار ہا روپیہ چند
منٹ میں جیت لئے ہیں اس کے ہاں شادیانہ بچتے ہوتے ہیں۔ پرانی آبادی کو ویران کر کے محکمہ آرائش بلدہ

وہاں ایک خوشنما و خوش فضا پارک بنوانا ہے، خلقت وہاں تفریح کے لئے اُمڈ اُمڈ کے جمع ہوتی ہے اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستوں کا جمع لگا رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال گیا ہے کہ کتنے مکانات مسمار ہو کر یہ قطعہ زمیں پارک کے لئے نکلا ہے اور ان مکانات کے مکینوں کے دلوں پر اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت اور انھیں منہدم ہوتے دیکھ کر کیا کچھ گزری ہوگی! ایک فاتح اپنی فتح مندیوں کا جشن مناتا ہے، مگر یہی کبھی یاد کرتا ہے کہ اس کے باعث کتنے خاندان برباد، کتنے گھر بے چراغ، اور کتنے زندہ مردہ ہو چکے ہیں! یہ بات ہی صاف مجھ سے سُن، کتاب میں اس کو کیا پڑیگا حدودِ دنیا کے ہیں معین جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑیگا انسان معاصی سے دستکش عموماً اُسی وقت ہوتا ہے جب گناہوں کی قوت سلب ہو چکتی ہے۔ ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہے، نفس پرستیوں اور یہ کاریوں کا سلسلہ موقوف نہیں ہوتا۔

معرضِ بھی کوئی حق کو کبھی ہو جاتا ہے مگر اس نرم میں سچ ہے کہ ”جی ہاں“ ہی بہت وعظِ تقویٰ نہ کو حرمِ کردا کبر پر چشم بد و را بھی طاقتِ عصیاں بہت نیک کاری و بد کاری کا ایک عمدہ معیار یہ ہے کہ اول الذکر کے بعد طبیعت میں گشتگی پائی جاتی ہے اور آخر الذکر کے بعد سعی و اخفا جو بزدلی کے مرادف ہے۔

شگفتہ پایا طبیعت کو بعدِ کارِ ثواب دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد کتابی معلومات انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے اچھی صحبت ناگزیر ہے۔ عالمِ بےلِ بی لوگ گنلاتے ہیں، جن کے دین کتابی معلومات سے بسر ہیں، لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بتاتے ہیں جس تجو ہم کو آدمی کی ہے وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

انسان کے خلاف مزاج دُنیا میں ہزار ہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن کارخانہ دہر کو اپنی مرضی مطابق چلانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے مالِ اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر ناملائم واقعہ پر صبر و

لے ایک اور موقع پر ہے

کام نہ نکلے گا نہ ای دوست کتب خانوں سے رہے کچھ روز کسی محرمِ سرا کے ساتھ

تسلیم سے کام لے۔ انسان نازا اسی سے کر سکتا ہے، جو اس کا ناز بردار ہو۔ تمام موافق طبع و غیر موافق طبع حوافظ پر صبر و تحمل کرنا۔ بہت کا لالچ نہ کرنا، کم کا غم نہ کرنا، یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہنسی خوشی کا ٹہن دیں گے۔

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں
بیچ آتا ہی مجھے غصہ مگر کس پر کروں
چل بے چھوٹے بڑے تھا جن سے لطف زندگی
مجھ پہ کس کو ناز ہی میں ناز اب کس پر کروں
وصل کی شب حسب موسم ہو ہی جائے گی بسر
لطف اٹھاؤں یا درازی کی دُعا شب بھر کروں
دور بے مہری اُمید محبت کس سے ہو
اڑ رہی ہی خاک ہر سو کس کے دل میں گھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص مصلحت کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ ہر فعل کا ادنیٰ سے ادنیٰ کیوں نہ ہو معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہیگا۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور دل کو میث و عشرت کے پھندے میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہے۔ عام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل نزل میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

اکبر اس فطرت خاموش کو بے حس نہ سمجھ
ہاں بصیرت سے تھی دیدہ زر گس نہ سمجھ
راحتِ زلیخا کے سامان سے دھوکے میں نہ آ
امتحان گاہ کو تو میث کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کا رہ رکھ
خاتمہ جس کا ہوا افسوس سے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسنِ عمل
بہرِ انجام یہ امرت ہی اسے بس نہ سمجھ
دل کا دنیا کی اُمیدوں سے بھلنا ہی بُرا
زندگی تلخ کریں گی انھیں مونس نہ سمجھ

تعصّب اور غصہ کے جذبات عموماً تانگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے مہتے ہیں۔ انسان کی نظروں جو اسیج ہوتی جاتی ہیں۔ نفرت و تعصّب بھی نجات ملتی جاتی ہے۔ البتہ کارخانہ فطرت کی عظمت و تنوع کو دیکھ کر حیرت طاری ہوتی رہتی ہے۔

شیخ جی کی نظریں میں ہوں فقط
میری نظروں میں ساری دنیا ہی
بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر
مجھ کو حیرت ہے اُن کو غصہ ہی

علائق دنیوی کی کثرت ہمیشہ افزائش غم و الم کا سبب بنے گی۔ امن و عافیت مقصود ہی تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیے۔

ایک جتنا ہے ایک پگھلتا ہے کام دنیا کا یونہی چلتا ہے
دل تعلق بڑا کے پھپھتا یا پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب بینی و نقص جوئی میں تبت پیش پیش آتا رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطا کاریوں کی جانب کبھی جھوٹے سے بھی توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کس پر کلف انداز سے ادا کرتے ہیں۔

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا یہ تو کیے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اسی کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کہ وہی اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انسان ساری دنیا کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔ لیکن خود اپنی ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا۔ نہ پھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

محض گوشہ نشینی تزکیہ اخلاق کے لئے کافی نہیں، اصل شو قلب کی بے تعلقی ہو اور اس کا مدار عمل پر ہی۔ اچھی باتوں کے زبانی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں، دل سے ماننے والے جوان پر عمل کر دکھائیں بہت کم بکھٹے ہیں۔

حرص و نیل سے نہیں ہر صاحب عزت بری خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کوٹنا اور ہے

مدحت گفتار کو سمجھو نہ احسناتی سند خوب کہنا اور ہی اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری جو دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے اور انسان کے عصر خصوصیت کے ساتھ جس کا

شکار ہو رہی ہیں یہ ہے کہ انسان بدکاروں کی بدکاری پر انھیں برا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے اور خود اپنی اصلاح کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ یہ صورت حال اکبر کے فلسفہ اخلاق (یعنی اسلامی تعلیم) کے بالکل مخالف ہے یہاں ثواب کا عمل عبادت باری تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ شیطان پر لعنت بھیجنے کو۔ یورپ والے اگر ہمیں بے بس و بیکس سمجھ کر ہمیں ہدف مظالم بنا رہے ہیں تو انھیں کوستے رہنا ہمارے ہاں کی تعلیم نہیں۔ ہم کو اپنی حالت کی ترقی و اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اغوا کی ایک جدید ترکیب یہ نکالی ہے کہ بندگان خدا سے اپنے اوپر منت بھجواتا رہتا ہے کہ اس مشغولیت سے انھیں حمد باری کی فرصت

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی خدا کی حمد کیجئے ترک بائیں مجھ کو بُرا کئے
ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ دشمن اگر ہمارے ساتھ ظلم و ستم کر رہا ہے اور ہم محض اس پر لعنت
بھیجنے پر قانع ہیں تو ہم اور وہ دونوں تباہ ہو کر رہیں گے۔ فطرت اُس سے جو رو ستم کا انتقام لے گی اور ہم
ہماری غفلت و جہود کا۔ عدو کی تباہی ہماری ترقی کی مستلزم نہیں ۵

یہی خصائل ہی طبیعت رہی تو قیمت یہی رہی گئی زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہی
یہی سہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح اُمید کیا یہی ہر زلفِ بتا کا سودا تو میری شامت یہی رہی
عمل جیبا پز نہیں ہیں اچھی تو ذکر عصیان غیر کیا عدو کی قیمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قیمت یہی رہی
سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے جسے تمام ہادیان مذہب تمام
ائمہ اخلاق مشرق سے بتاتے چلے آئے ہیں یعنی علیا بق دنیوی سے تا بہ امکان اعراض اور خالصتہ طاعت
حق میں مصروفیت۔ مولانا رومی ارشاد فرماتے ہیں ۵

بہج کُنچے بے دد و بے دام نیست جز بہ جنسِ لوگاہِ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف کی بھی ہے ۵

جواہلِ دنیا کا رخ کر دو گے، سکون خاطر کبھی نہ ہو گا شریکِ غفلت بہت ملیں گے، شریکِ عبرت کوئی نہ ہو گا
یہی ہر مذہب کا جزو اعظم کہ دینِ دنیا پہ ہو موقت ہم نئی طریقہ میں لیکن اے دوست ہو گا سب کچھ یہی نہ ہو گا
صدیوں پیشتر اس آوازِ حق کی منادی کر دی گئی تھی کہ اطمینانِ قلب و راحتِ دل صرف اُن لوگوں کا
حصہ ہے جو ایمانِ کامل رکھتے ہیں اور اپنی بد اعمالیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ
اَخْتَارَ بِالْاَمَانِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۵ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَلَّمَلِيسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِطُلُمٍ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْاٰمِنُ
وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (انعام - ۹) اکبر کی آواز بھی اسی آوازِ حق کی صدائے باز گشت ہے۔ خلقت کو اصلاح
دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ انہیں کا ترجمہ
اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں نہ راکان لگا کر سُنا ۵

(۱) یہ عزم ترا سچی بے وساز ہو کیوں کہ اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیوں کہ

(الف) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ آيَاتُنَا لَكُمْ (شوریٰ ع ۴) جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہو خود تمہاری ہاتھوں آتی ہو
(ب) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ سَيِّئَةٍ مِنْ نَفْسِكُمْ (نساء ع ۱۱) تمہیں جو کچھ بھی بُرائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوئی ہو
(ج) إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ مَا يُخِيرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (رعد ۱۲)

وہ خود نہ اپنی حالت بدلے۔

(۲) اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہی کام طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا یہ ہی کام
(الف) وَاللَّهُ خَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف - ۲)

ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہی۔

حکومت و اختیار صرف خدا کا ہی۔

آنے کی نہیں کام فقط حرص ہو کچھ

مسلمانوں فلاح عاقبت نہ تمہاری تنادوں پر موقوف ہو نہ اہل کتاب
کی تنادوں پر بلکہ عمل پر موقوف ہی پس جو شخص بُرا کام کر چکا اسکی سزا پہنچا

تخصیص تری کیا ہی حریفوں کو بھی حق ہی

وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا تمہیں میں کا فر بھی
اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی۔

اک آج اگر صاحب طاقت ہی تو اک کل

ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں
کھوٹے کو جہاد کر دے وہی بات کھری ہے

تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہو وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہو

جو لوگ عزت کے خواستگاریں سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی

(۳) اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہی کام

(الف) وَاللَّهُ خَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف - ۲)

(ب) إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا (بقرہ - ۲۰)

(ج) إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (یوسف - ۵)

(۴) بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر و ماکچہ

(الف) لَيْسَ بِأَمَانِكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلَ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءً يُجْزَ بِهِ (نساء - ۱۸)

(۵) منظور اگر کبر و تفاخر کا سبق ہی

(الف) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْكُمْ كَافِرًا مِنْكُمْ مُؤْمِنًا (تغابن - ۱)

(۶) یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل

(الف) وَتِلْكَ الْأَيَّامُ قَدْ أَهْلَيْنَا بَيْنَ النَّاسِ (الاحزاب - ۲۵)

(۷) نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے

(الف) إِنَّ أَوْلَىٰ لَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ طَاعَتًا (مجادلہ - ۲۲)

(ب) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (طہ - ۲۵)

”غیر متدن“ کی زندگیوں کا موازنہ کافی ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں۔ آہ سرد کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ اپنا اخلاق، اپنا ایمان، اپنا جوہر شرافت، سب ہم نے آپ کی خوشنودی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو محض آپ کی خاطر بیگانہ کر لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے مصائب میں اضافہ ہی ہو رہا ہے، اور اخلاقی پلہ روز بروز ہلکا ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

مری عمل سے بیشع خوش ہیں بھائی خوش ہیں باپ خوش ہیں مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں جو دیکھا سائیں کا یہ چکر دھرم پچا کہ اسے برادر ہماری دُوری میں پُن گن تھی، تمہاری دُوری میں پاپ خوش ہیں ”ہمارا“ ”اُن کا“ مشرق و مغرب کا یہ جو اختلاف ہے، جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے، فروغ میں نہیں، اصول میں ہے۔ عوارض میں نہیں، ذوات میں ہے۔ بخت و اتفاق سے نہیں، جبلت و سرشت میں ہے۔ وہ مادیات میں مست ہیں، ہم روحانیاں میں غرق۔ وہ ذہانت و تیز رفتاری، لذت و ناموری کے بھوکے ہیں، ہم سنجیدگی و سلامت رومی، راحت و گمنامی کے قدردان ہیں۔ وہ تجارت و ثروت کی گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں، ہم فقر و استغنا کے حجرہ میں معتکف ہیں۔ ان پر حصول ممالک و خزائن کی دُھن سوار ہے، ہم تسخیرِ قلوب و نفوس کے عمل میں مشغول ہیں۔ وہ دنیا ہے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم خود اپنے نفس سے نہیں اپنے کو ملبس و نیوٹن، کو پرنیکس و گلیلو، ڈیکارٹ و کینٹ پر ناز ہے۔ ہمیں اپنے کرشن و گوتم بدھ، نانک و کبیر، حضرت صدیق و حضرت امیرؑ پر فخر ہے۔ وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ وہ انتہائے عقل و تحقیق میں یہ دریافت کر کے اُچھل پڑتے ہیں کہ ”انسان بند رہی“ ہم انتہائی بد مستی و بیہوشی میں پھارنے لگتے ہیں کہ ”انسان خدا ہے“ اکبر اس دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں۔

مشرقی کو ہے ذوق روحانی مغربی میں ہے میل جسمانی

کما منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مری اک سو ”فکر ہر کس بہ قدر بہت اوست“

اکبر محض واعظ نہ تھے، حکیم اخلاق بھی تھے۔ راہِ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے

ولے نہ تھے، بلکہ اس راستہ کی پیچیدگیوں اور سفر کی دقتوں سے بھی واقف تھے، اس لئے آئندہ مسافروں کو ان چیزوں کی بابت بھی ہدایات دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مسائل بہ غایت پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، جذبات فطرت کی کشش ایک سمت ہوتی ہے، عاقبت اندیشی کا فتویٰ اس کے مخالف جانب ہوتا ہے۔ اگر نہ بجا ان گتھیوں کو بھی سلجھایا ہے۔ ان کے کلام میں متعدد مقدمات ایسے آتے ہیں، جہاں اخلاق و معاشرت کے جزئیات نہیں، بلکہ فلسفہ اخلاق کے اصول کو بیان کیا ہے، اور مسائل اساسی کی عقدہ کشائی کی ہے۔

شباب کی بدستیاں بڑے احتیاطیاں جس غضب کی ہوتی ہیں، ہر شخص پر روشن ہیں۔ ساتھ ہی مذہب و اخلاق کے دارالافتاء سے ہر لغزش پر انتہائی تفریر کی وعید موجود ہے۔ اگر اس مسئلہ سے متعلق پہلے حکیمانہ ترفٹ نکال دیا جائے، انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، اور مرض کی ایک ایک علامت بیان کر جاتے ہیں، اس کے بعد نسخہ شفا تجویز کرتے ہیں یہ تشخیص اور یہ علاج اس قدر مکمل ہے کہ اس میں ایک حرف کی ترمیم و اضافہ کی گنجائش نہیں، ارشاد ہوتا ہے:

نیچر کو ہونی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک ہے شیطان نے وی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہر دو شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوفِ خدا ہی اس کی خواہش
بہت سے لوگ مذہب سے متعلق واقفیت و معلومات محض اس لئے حاصل کر رکھتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے
ان کا اظہار کرتے رہیں، یا یہ کہ دوسروں کے افعال پر رائے زنی کرتے رہیں۔ خود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں
مقصود نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی زبانی واقفیت محض لاپرواہی حاصل ہے۔ مذہب اخلاق سے فائدہ اُسی وقت حاصل
ہو سکتا ہے جب ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انھیں جزو زندگی بنا لیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے تذکرہ سے گرمی
محصل کا کام لیا جائے۔ لیکن عمل بغیر نفس کشی کے ممکن نہیں۔ نفس کو لذت تو صرف دوسروں کے بتانے میں
آتی ہے۔

علم دیں حاصل کیا، لیکن قباحت یہ ہوئی صرف سکھانے میں لذت ہی عمل میں کچھ نہیں

زیست کا مصروف بنے خود آہ سوزناں تب ہر لطف ورنہ لے اگر تری نظم غزل میں کچھ نہیں

کسی مذہب کا نام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شے پاکیزگی اخلاق ہے۔ کفر و ایمان مذہبی اصطلاحیں ہیں جو اخلاق حسنہ

داخلات سنیہ کے مرادف ہیں جو پاک طینت ہیں وہ مومن ہیں، جو بد طینت ہیں، کافر ہیں ۛ

مرنے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں جو اچھے ہیں؟ مومن ہیں بُرے جو ہیں؟ کافر ہیں

وہی ہیں پاک طینت لوگی ہے جن کی خالق سے نہیں ہی شرک کی جن میں نجاست بس؟ ظاہر ہیں

موجودہ زمانہ میں مذہب کی سوشل حیثیت بہت اہم ہو گئی ہے۔ ایک شخص عیسائی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیوں سے میل جول رکھتا ہے، کھانے پینے رہنے سنے کا طریق فرنگیوں کا سا رکھتا ہے، بڑے دن کے روز خوشی مناتا ہے۔ اگر شیعہ ہے تو معنی یہ ہیں کہ حُرَّم میں مجلس کرتا ہے، ماتم میں شریک ہوتا ہے۔ تغزیہ رکھتا ہے، شیعہ سوسائٹی میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اگر سنی ہے تو معنی یہ ہیں کہ محفل میلاد کرتا رہتا ہے۔ صوفیہ کرام کی عظمت رکھتا ہے، اہل سنت کی تقریبات میں شریک رہتا ہے، اپنے گھر کی ریت رسم سنیوں کی سی رکھتا ہے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر لیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی اور اپنے سوشل طریقوں میں تغیر کر دیا۔ نجات و نکال اُخروی کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے، لیکن مذہب کی ظاہری ہیئت محض ایک معاشرتی و اخلاقی واقعہ ہے۔ اس لئے دُنیا کو یہ دیکھنے کی بالکل حاجت نہیں کہ فلاں کے معتقدات کیا ہیں، بلکہ دیکھنا صرف یہ چاہیے کہ اس کے اعمال و اخلاق کیسے ہیں ۛ

مذہب ہوا مرقومی، سمجھو نہ فعل ذاتی معذور سب ہیں اس میں گنگو ہوں یا وفاقی

شیعہ ہوں خواہ سنی لالہ ہوں یا برہمن مذہب کو مورثوں سے سب پاتے ہیں عموماً

پولٹیکل ضرورت بیشک حق اس کی اوّل اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل

اچھا بُرا نہ کہہ دو تم مذہبی بنا پر اخلاق اس کے دیکھو اصلی تو یہ ہے جو ہر

تعلیم ہی جو عمدہ صحت اگر ہے اچھی پادگے اس کو اچھا طینت اگر ہے اچھی

ناری ہی یا کہ ناجی، اس کا بیاں نہیں ہے سوشل طریق یہ ہے اور وہ تو راز دیں ہے

قانون فطرت ایسا رکھا گیا ہے کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں۔ ایک شخص

قمار بازی میں ہزار ہا روپیہ ہار بیٹھتا ہے اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے لیکن جس شخص نے ہزار ہا روپیہ چند

منٹ میں جیت لئے ہیں اس کے ہاں شادیانہ بچتے ہوتے ہیں۔ پرانی آبادی کو ویران کر کے محکمہ آرائش و

وہاں ایک خوشنما و خوش فضا پارک بنوانا ہے، خلقت وہاں تفریح کے لئے اُمڈ اُمڈ کے جمع ہوتی ہے اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیتوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال گیا ہے کہ کتنے مکانات مسمار ہو کر یہ قطعہ زمیں پارک کے لئے نکلا ہے اور ان مکانات کے مکینوں کے دلوں پر اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت اور انھیں منہدم ہوتے دیکھ کر کیا کچھ گزری ہوگی! ایک فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے، مگر یہی کبھی یاد کرتا ہے کہ اس کے باعث کتنے خاندان برباد، کتنے گھر بے چراغ، اور کتنے زندہ مردہ ہو چکے ہیں!

یہ بات ہی صاف غج سے سن، کتاب میں اس کو کیا پڑیگا حدودِ دنیا کے ہیں معین جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑیگا انسان معاصی سے دلکش عموماً اُسی وقت ہوتا ہے جب گناہوں کی قوت سلب ہو چکتی ہے، ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہی، نفس پرستیوں اور یہ کاریوں کا سلسلہ موقوف نہیں ہوتا ہے

معرض بھی کوئی حق کو کبھی ہو جاتا ہے مگر اس میں سچ ہے کہ ”جی ہاں“ بہت وعظِ تقویٰ نہ کہو جسمِ کردا کبر پر چشم بد دور ابھی طاقتِ عصیاں بہت

نیک کاری و بد کاری کا ایک عمدہ معیار یہ ہے کہ اَوّل الذکر کے بعد طبیعت میں گفتگو پائی جاتی ہے اور آخر الذکر کے بعد سعی و اخفا، جو بزدلی کے مرادف ہے

شگفتہ پایا طبیعت کو بعدِ کارِ ثواب دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

کتابی معلومات انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے اچھی صحبت ناگزیر ہے۔ عالمِ بے عمل یہی لوگ کہلاتے ہیں جن کے دین کتابی معلومات سے لبریز ہیں لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں

کو رس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بتاتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

انسان کے خلاف مزاحِ دنیا میں ہزار ہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن کارخانہ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے مالِ اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر نامالایم واقعہ پر صبر و

لے ایک اور موقع پر

کام نکلنے کا نہ ای دوست کتب خانوں سے رہے کچھ روز کسی محرمِ امرار کے ساتھ

تسلیم سے کام لے۔ انسان ناز اسی سے کر سکتا ہے، جو اس کا ناز بردار ہو۔ تمام موافق طبع وغیرہ موافق طبع خواہ
پر صبر و تحمل کرنا۔ بہت کالاج نہ کرنا، کم کا غم نہ کرنا، یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دیں گے۔

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں
چل بے چھوٹے بڑے تھا جن سے لطفِ زندگی
بچ آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں
مجھ پہ کس کو ناز ہے میں ناز اب کس پر کروں
وصل کی شب حسبِ موسم ہو ہی جائے گی بسر
لطف اٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں
دور بے مہری اُمید محبت کس سے ہو
اُڑ رہی ہے خاک ہر سو کس کے دل میں گھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص مصلحت کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ ہر فعل کا ادنیٰ سے ادنیٰ کیوں نہ ہو معاوضہ
کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہیگا۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور دل کو عیش و عشرت کے
پھندے میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے ساتھ گزر سکتی ہے۔ عام حیات میں تلخی پیدا
کرنے والی ہماری ہی غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل نزل میں نہایت خوبی کے ساتھ
ادا کیا ہے۔

اکبر اس فطرتِ خاموش کو بے حس نہ سمجھ
راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں آ
ہاں بصیرت سے تھی دیدہ نرگس نہ سمجھ
امتحان گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبتِ کار پہ رکھ
خاتمہ جس کا ہوا فوس اسے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو جس عمل
بہرِ انجام یہ امرت ہی اسے بس نہ سمجھ
دل کا دنیا کی اُمیدوں سے بھلنا ہی بُرا
زندگی تلخ کریں گی انھیں مونس نہ سمجھ

تعصّب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظروں میں جو کچھ
ہوتی جاتی ہے۔ نفرت و تعصّب بھی نجات ملتی جاتی ہے۔ البتہ کارخانہ فطرت کی عظمت متنوع کو دیکھ کر
حیرت طاری ہوتی رہتی ہے۔

شیخ جی کی نظریں میں ہوں فقط
بہرِ حیرت ہے کہ اے اکبر
میری نظروں میں ساری دنیا ہے
مجھ کو حیرت ہے اُن کو غصہ ہے

علائق دنیوی کی کثرت ہمیشہ افزائش غم و الم کا سبب بنے گی۔ امن و عافیت مقصود ہی تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے ۵

ایک جتنا ہے ایک گھٹتا ہے کام دُنیا کا یونہی چلتا ہے
دل تعلق بڑا کے پھپھتا یا پانوں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب بینی و نقص جوئی میں بہت پیش پیش آتا رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطا کاریوں کی جانب کبھی بھولے سے بھی توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کس پر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ۵

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا یہ تو کیسے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اسی کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کہ وہی اس کی اصلی کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انسان ساری دُنیا کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔ لیکن خود اپنی ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا ۵

نہ پھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے

محض گوشہ نشینی تزکیہ اخلاق کے لئے کافی نہیں، اصل شو قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے۔ اچھی باتوں کے زبانی داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں دل سے ماننے والے جو ان پر عمل کر دکھائیں بہت کم نکلتے ہیں

حرص دُنیا سے نہیں ہر صاحب عزت بری خالقا ہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے

بدعت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند خوب کسنا اور ہی اور خوب ہونا اور ہے

نفس بشری کی ایک خاص کمزوری جو دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے اور انسان کے عصر خصوصیت کے ساتھ جس کا

شکار ہو رہی ہیں یہ ہے کہ انسان بدکاروں کی بدکاری پر انھیں برا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے اور خود

اپنی اصلاح کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ یہ صورت حال اکبر کے فلسفہ اخلاق (یعنی اسلامی تعلیم) کے بالکل مخالف ہے

یہاں ثواب کا عمل عبادت باری تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ شیطان پر لعنت بھیجنے کو یورپ والے اگر ہمیں

بے بس دیکھیں سمجھکر ہمیں بدعت مظالم بنا رہے ہیں تو انھیں کوستے رہنا ہمارے ہاں کی تعلیم نہیں۔ ہم کو اپنی

حالت کی ترقی و اصلاح کی فکر کرنا چاہیئے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اغوا کی ایک جدید ترکیب

یہ نکالی ہے کہ بندگانِ خدا سے اپنے اوپر لعنت بھجواتا رہتا ہے کہ اس مشغولیت سے انھیں حمد باری کی فرصت

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو بُرا کئے
ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ دشمن اگر ہمارے ساتھ ظلم و ستم کر رہا ہے اور ہم محض اس پر لعنت
بھیجنے پر قانع ہیں تو ہم اور وہ دونوں تباہ ہو کر رہیں گے۔ فطرت اُس سے جو روستم کا انتقام لے گی اور ہم
ہماری غفلت و جمود کا۔ عدو کی تباہی ہماری ترقی کی ستلزم نہیں ۵

یہی خصائل ہی طبیعت رہی تو قیمت ہی رہی گئی زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہی
یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو نور صبح اُمید کیا یہی ہر زلفِ بتا کا سودا تو میری شامت یہی رہی
عمل جی اپنی نہیں ہیں اچھو تو ذکر عصیان غیر کیا عدو کی قیمت بگر بھی جائے تو اپنی قیمت یہی رہی
سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے جسے تمام ہادیان مذہب تمام
ائمہ اخلاق شرع سے بتاتے چلے آئے ہیں یعنی علیاقِ دنیوی سے تباہ امرکان اعراض اور خالصتہ طاعت
حق میں مصروفیت۔ مولانا دروچی ارشاد فرماتے ہیں ۵

یہی کتنے بے دود بے دام نیت جزیہ حسلو نگاہِ حق آرام نیت

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف کی بھی ہے ۵

جواہلِ دنیا کا رخ کر دگے، سکون خاطر کبھی نہ ہوگا شریکِ غفلت بہت ملیں گے، شریکِ عبرت کوئی نہ ہوگا
یہی ہر مذہب کا جزو اعظم کہ دین دنیا پہ ہو مقتدمہ و طریقہ میں لیکن اے دوست ہو گا سب کچھ یہی نہ ہوگا
صدیوں پیشتر اس آوازِ حق کی منادی کر دی گئی تھی کہ اطمینانِ قلب و راحتِ دل صرف اُن لوگوں کا
حصہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں اور اپنی بد اعمالیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ
اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَلَّمٰ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ
وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (انعام - ۹) اکبر کی آواز بھی اسی آوازِ حق کی صدائے بازگشت ہے۔ خلقت کو اصلاح
دنیوی کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ حمید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ انھیں کا ترجمہ
اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں ذرا کان لگا کر سننا ۵

(۱) یہ عزم ترا سعی بے و ساز ہو کیوں کہ اسباب نہ ہوں جمع تو آفا زہو کیوں کہ

(الف) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَمَا كَسَبَتْ آيَاتُكُمْ (شوری - ع ۴) جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے خود تمہاری باتوں کی ہے

(ب) وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ سَيِّئَةٍ مِنْ نَفْسِكُمْ (ساء - ع ۱۱) تمہیں جو کچھ بھی بُرائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوئی ہے

(ج) إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ مَا يُخَيِّرُوا مَا خَدَّاسِي قَوْمٍ كِي حَالَتِ أَسْ وَتِ تَك نِيں بَدَلَتَا تَك

وہ خود نہ اپنی حالت بدلے۔

بِأَنفُسِهِمْ (رعد - ۱۲)

طالب ہو خدا ہی سو دعا ہی کا ہی یہ کام

(۲) اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ کام

خدا ہر قسم کے فراہمی اسباب پر قادر ہے۔ لیکن اکثر لوگ

(الف) وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف - ۳)

اس سے بے خبر ہیں۔

ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

(ب) إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا (بقرہ - ۲۰)

حکومت و اختیاء صرف خدا کا ہے۔

(ج) إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (یوسف - ۵)

آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ

(۳) بے طاعت و نیکی نہیں تا یر و ما کچھ

مسلمانوں فلاح عاقبت نہ تمہاری متناؤں پر موقوف ہو نہ اہل کتاب

(الف) بَلَيْسَ بِأَمَانِكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلَ الْكِتَابِ

کی متناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے پس جو شخص بُرا کام کرے گا اسکی نجات پائیگا

مَنْ يَعْمَلْ سُوءً يُجْزَ بِهِ (ساء - ۱۸)

تخصیص تری کیا ہے حرفیوں کو بھی حق ہے

(۴) منظور اگر کبر و تفاخر کا سبق ہے

وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا تمہیں میں کا فر بھی

(الف) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْكُمْ كَافِرًا

اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی۔

مِنْكُمْ مُؤْمِنًا (تہاب - ۱)

اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل

(۵) یہ کشمکش فطرت دنیا بے مسلسل

ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں

(الف) وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (الاحقران - ۴)

کھوٹے کو جڈا کر دے وہی بات کھری ہے

(۶) نیکی کی طرف رخ ہو یہی ناموری ہے

تم میں جو سب زیادہ پاکباز ہے وہی خدا کے نزدیک سب معزز ہے

(الف) إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ (حجرات - ۲۶)

جو لوگ عزت خواستگار ہیں سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی

(ب) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (فاطر - ع ۲)

لیکن یہ سارا دفتر و غلط و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف اور فطرت کی رفتار، مشیت الہی کا رخ دوسری طرف جس ماورائے عقل انسانی و مافوق فہم بشری ہستی نے انبیاء کرام کے خرات ہدایت کو ایک محدود دائرہ سے آگے نہ بڑھنے دیا، جس نے ہادیان عظم کی مساعی کے باوجود دلوں سے رنگ نہ دُور ہونے دیا، جس نے مُرشدانِ کامل کے حلقہ فیض کو ہر دُور میں بہت ہی مختصر رکھا، وہ اپنی عادت جاریہ میں مبیوں صدی کے ایک مُصلح شاعر کی خاطر فرق نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ ہدایت و ضلالت، انسان کے اختیار کی چیزیں نہیں کارخانہ کائنات کی بنیاد و جُصلت پر رکھی گئی ہے، اسی پر یہ کارخانہ برابر چلتا رہیگا۔ بڑی بڑی مقبول و برگزیدہ ہستیاں بھی فطرت کے اس کورس کو نہیں بدل سکتیں۔ وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَكَوْهَصْتِ بِمُؤْمِنِينَ (یوسف - ۱۱) اُبھر بھی اس تماشہ گاہ پر اپنا پارٹ جملہ لوازم کمال و جمال کے ساتھ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ لیکن چلتے چلتے یہ بھی کتے گدے کہ میری یا کسی کی تبلیغ سے زمانہ کا رخ نہیں پھر سکتا، چند روزیں اجداد و اسلاف کے باقی آثار بھی افسانہ پارینہ ہوں گے، اور اُس وقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا، اس لئے کہ احساسات بدلے ہوئے ہوں گے کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کوئی قیمتی چیز ہم سے ضائع ہو گئی ج

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

بچہ عنفوان شباب میں قدم رکھتے وقت جدید احساسات کا مزہ لینے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ بھولے سے بھی ادھر خیال نہیں جاتا کہ کیسے قابل رشک سکھ اور بفکری کا زمانہ رخصت ہو رہا ہے اور فکروں اور ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر پڑنے والا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے۔ مگر کب؟ جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہو تا ہے۔ یہی حشر ہماری موجودہ معاشرت کا بھی ہونا ہے۔ اکبر کے جامِ جم میں اس قلبِ ماہیت کے ایک ایک جزیہ کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہوگا، مرثیہ کا یہ آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کے لُٹتوی کر دیا جائے ۷

نئی تہذیب ہوگی اور نئے سماں ہم ہوں گے
نہ ایسا بیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

یہ موجودہ طریقے راہی ملکِ عدم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے جیس اپنی

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردہ کی یہ پابندی
بدل جائیگا انداز طبائع و درگردوں سے
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
نئی صورت کی خوشیاں اونٹو سامانِ غم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
بہت ہوں گے معنیِ نغمہ تقلیدِ یورپ کے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پستلے صنم ہوں گے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہوں گے
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے صنم ہوں گے
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب کم ہوں گے
کتابوں ہی میں دفنِ افسانہ جاہ و شہم ہوں گے
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہو گا نہ صنم ہو گا

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہی وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

احوالِ اسم

(از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پنی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن)

اُردو بولنے والی قوم اپنی زبان کے صرف و نحو سے ایسی بے پرواہی کہ دنیا کی متمدن قوموں میں اُس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اسی بے پرواہی کا نتیجہ ہے کہ عوام کی نظریں اُردو ایک بے قاعدہ زبان تصور کی جانے لگی ہے۔ مگر سچ پوچھو تو یہ خیال بالکل بیجا ہے۔ ہر زبان کی صرف و نحو میں کچھ نہ کچھ دقتیں یا پیچیدگیاں موجود ہیں جن کو سلجھانے کی کوشش اُس زبان کے نحویوں کی طرف سے ہوتی رہی اور رفتہ رفتہ اس بحث پر اتنا مواد جمع ہو گیا کہ زبان کے سیکھنے والے اُس کی مدد سے اپنی مشکلوں کو آسانی سے حل کر سکتے ہیں۔ اُردو میں بھی تک ایسا مواد اتنا کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اُردو صرف و نحو کے سارے پیچیدہ مسئلے ایک ایک کر کے سلجھائے جائیں۔ اس مضمون میں ”احوالِ اسم“ کو بیان کرتا ہوں۔ ارباب ذوق سے امید ہے کہ اس میرے بیان میں جو قسم یا کمی پائیں اُس سے مجھے ضرور اطلاع بخشیں گے۔

اُردو میں اسموں کے آخر میں الف یا اُس کا کوئی ہم آواز حرف : ہ، ی، ر، ع، کبھی بدل کے سے، دون یا و ہو جاتا ہے۔ فارسی اور انگریزی میں جن کی تحصیل کا ہندوستان میں عام رواج ہے۔ ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں

لے مولوی نواز حسن نے اس تبدیلی کو اِمالہ قرار دیا ہے (ادبِ اُردو، لکھنؤ، بابت جنوری ۱۹۲۲ء ص ۲-۴) لیکن اِمالہ ایک اور ہی چیز ہے، اس اُردو والی تبدیلی کو اُس سے سرمؤ تعلق نہیں۔ ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ عربی میں اِمالہ کیسے کہتے ہیں۔ قوم عربی میں اِمالہ نہیں پایا جاتا اس بعد کی عربی میں اور جہاں عربی بولی جاتی ہے اُن میں بعض مقامات میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔

امالے کا اثر لفظ کے معنی پر مطلق نہیں ہوتا۔ صرف تلفظ پر ہوتا ہے یعنی فتح ایک مجہول کسرہ ہو جاتا ہے یا الف ماقبل مفتوح کی جگہ پر ہی، قبل مکسور بولی جاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ آ سے (مَجْہول کسرہ) اور آ سے آ سے (مَجْہول سے) ہو جاتا ہے۔ بعض حالتوں میں کسرہ اور قی مجہول نہیں بلکہ معروف ہوتے ہیں۔ مثالیں یہ ہیں :- سرِ کاب سے سرِ کِیَب، لکِن سے لیکِن، یاب سے ہیَب، لسان سے لِسین، ایسی تغیر سے لفظ کے معنی یا حالتِ نحوی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہ حالتِ رفع میں ایک صورت (سرِ کاب) استعمال ہو تو حالتِ نصب

ہوتی۔ اس لہٰذا اردو بولنے والے جب ان زبانوں سے اپنی زبان کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان کو یہ تبدیل یکساں محسوس ہوتا ہے۔ پس پہلے یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اور زبانوں میں اس قسم کی تبدیل کہاں تک پائی جاتی ہے۔

عربی میں ایسی تبدیل کو صرف کہتے ہیں اور یورپ کی زبانوں میں ڈیک لینشن (Declension) یعنی گردان۔ کسی گردان میں اُسم کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں اُن میں سے ہر ایک کو انگریزی میں کیس (Case) لاطینی (Declension کا زس) اور عربی میں حالت کہتے ہیں۔ ترکی میں ان کے لئے احوال اُسم اصطلاح مقرر ہے۔

بہت سی زبانیں ہیں جن میں اُسم کی کئی حالتیں ہوتی ہیں جیسے عربی میں تین (۱) فاعلی (جسے رفع کہتے ہیں) (۲) مفعولی (جسے نصب کہتے ہیں) (۳) اضافی و ظرفی (جسے جر کہتے ہیں) یونانی اور موجودہ جرمانی زبان میں اُسم کی چار حالتیں ہوتی ہیں: (۱) فاعلی، (۲) مفعولی، (۳) اضافی، (۴) ربطی۔ لاطینی میں چھ حالتیں ہیں (۱) فاعلی، (۲) مفعولی، (۳) اضافی، (۴) ربطی، (۵) اتراجمی، (۶) بذائی۔ ترکی میں بھی چھ حالتیں ہیں۔ مثلاً ترکی میں ”پدر“ کی گردان یوں ہوگی :-

اُحوال اُسم	واحد	معنی
(۱) فاعلی	پدر	باپ (نے)
(۲) مفعولی	پدری	باپ (کو)
(۳) ربطی	پدرہ	باپ (کو)

ملقیہ نوٹ صفحہ قبل یا حالت جزمیں دوسری (سکیم)

دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اِمالہ نقط کے درمیان میں واقع ہوتا ہو سکتا ہے لیکن اُردو کی جس تبدیل سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں وہ لفظ کے آخری میں واقع ہوتی ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ”اصطلاح قواعد اُردو میں اَلِف ء یا اِلِف مقصورہ کو جو الفاظ کے آخر میں پڑیں جمع کی حالت میں یا حرف ربط کے ساتھ یا سے جموں سے بدل دینے کو اِمالہ کہتے ہیں۔ اُردو کے قواعد کی کسی کتاب میں آج تک یہ اصطلاح ان ہمنوں میں استعمال نہیں ہوئی جس طرح شاہد ان سے شاہدین ہو جانا اِمالہ نہیں ہے۔ اسی طرح ترکا سے ترکے یا بندہ سے بندے ہو جانا بھی اِمالہ نہیں کہلا سکتا۔

ملے انگریزی میں صرف نمبروں کی حالت میں تبدیل ہوتی ہے جیسے جی۔ ہیریم وغیرہ۔
ملے عموماً یہ غلطیاں پیدا ہوا ہے کہ صرف پانچ گردان فعل کے ساتھ مخصوص ہے مگر اُسم کو صرف یا غیر صرف کہنا ہی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اُسم میں صرف کی گنجائش ہے۔

(۴) اضافی _____ پدرک (ملفوظ: پدرن) _____ باپ کا (کی کے)

(۵) ظرفی _____ پردہ _____ باپ میں

(۶) اخراجی _____ پدرون _____ باپ سے

قدیم فارسی (یعنی اوستا، اور ایران کے پیکانی کتبوں کی زبان) میں اُسم کی آٹھ حالتیں ہیں یعنی ترکی میں جو پچھالیس بیان ہوئیں اُن کے علاوہ اوزاری اور (۸) نداء ی۔ لیکن بعد کو وسطی زمانے کی فارسی (یعنی پہلوی وغیرہ) میں چون کہ اکثر اخیر گر چکے تھے اُسم کی مختلف حالتوں میں امتیاز باقی نہ رہا۔ البتہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے جس میں صرف دو حالتیں (یعنی قائم اور مُحَرَف) باقی رہ گئی ہوں گی اور پھر وہ مُحَرَف حالت بھی غائب ہو گئی۔ وسطی زمانے کی فارسی بلکہ موجودہ فارسی میں بھی لکھیں کہیں بعض مرکب لفظوں میں کسی اُسم کی مُحَرَف صورت کے آثار نظر آتے ہیں، جیسے کاریگر، برزگیر، کدیور، دیور (= دلاور) شینخون وغیرہ میں سے بعض ایرانی زبانوں جیسے پشتو، بلوچی، آسہ (یا اوسے تہنی) وغیرہ میں آج بھی اُسم کی دو حالتیں (یعنی قائم اور مُحَرَف) موجود ہیں۔

قدیم فارسی کی طرح سنسکرت میں بھی آٹھ حالتیں ہیں اور پراکرت میں سات (کیوں کہ پراکرت کی اکثر بولیوں میں ربطی اور اضافی کی صورت ایک ہی ہے) یہ سات گھٹ کر اُردو میں صرف دو رہ گئیں: ایک صحیح یا قائم، دوسری مُحَرَف۔ یہی حال اکثر موجودہ سنسکرتی زبانوں کا ہے۔ اب اگر سنسکرت کی طرح اُردو میں بھی آٹھ حالتیں قائم کی جائیں تو اُن کی صورت اس طرح پر ہوگی۔

واحد

حالت	اُردو - کیلا (نُذکر)	سنسکرت - کپل (نُذکر)
فاغلی	کیلا (یا کیلے نے)	کیلا: کپل

لے موجودہ فارسی میں صرف ایک نداء ی حالت باقی ہے، جیسے ”ساقیا“
لے یاد رہے کہ ”دلاور“ کو ”دل“ اور ”آور“ سے مرکب سمجھنا درست نہیں۔

لے اسی زبان جس ملک میں بولی جاتی ہے وہ ۴۲ درجے ۵ دقیقے اور ۴۳ درجے ۲۰ دقیقے شمالی عرض بلد اور ۶۱ درجے ۱۰ دقیقے اور ۶۲ درجے ۲۰ دقیقے مشرقی طول بلد کے درمیان واقع ہے اسی طرح ہر اسی قوم کوہ قاف کے دانوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سکونت پذیر ہے۔ اس علاقے کا رقبہ کوئی ۲۰۵ یا ۲۱۰ مربع میل ہے۔ اور ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق اسیوں کی تعداد صرف ۱۶۲۰۰۰ ہے۔
لے سنسکرت میں ”کپل“ یعنی باغاس (۴۴) کو کہتے ہیں اور اُردو ”کیل“ یا ”کیلا“ وہی لفظ ہے۔

کیلم	کیلا (یا کیلے کو)	مضوی
کیلا	کیلے کو	ربی
کیلا	کیلے کے ذریعہ سے	اڈزاری
کیلا	کیلے میں سے	اخراجی
کیلا	کیلے کے	اضافی
کیلا	کیلے کے اوپر تلے وغیرہ	ظرفی
کیل	کیلا سے	بڑا

ج

کیلا	کیلے (یا کیلوں نے)	فا
کیلا	کیلوں کو	مف
کیلا	کیلوں کو	رب
کیل	کیلے سے	او
کیلا	کیلے سے	یغ
کیلا	کیلے کے	اض
کیل	کیلے کے اوپر تلے وغیرہ	ظرف
کیل	کیلے سے	بڑا

اس مثال سے واضح ہو کہ سنسکرت میں ایک ایسا مذکر اسم جو زبر پر ختم ہوتا ہو حالت کے لحاظ سے مختلف آٹھ صورتیں اختیار کرتا ہو یعنی ہر حالت کے لئے ایک خاص لائحہ عمل لفظ پر داخل ہوتا ہو۔ بخلاف اس کے اردو میں الف پر ختم

ملے اردو میں جو حرف ظرفیت کے لئے آتے ہیں وہ یہ ہیں: پر کے اوپر، کے نیچے، کے تلے، تلے، کے اندر، کے اُدھر، میں کے اندر، سے، تک، کو (جیسے صبح کو وغیرہ)۔

سنسکرت میں اسم کی مختلف حالتوں میں جو حرف آخر میں زیادہ ہوتا ہے وہ مشتعل لفظ نہیں ہیں۔ اس لئے ان کو "ادانریا" لائقے "گنا چاہی" اردو میں جو صنفی حرف استعمال ہوتے ہیں (جیسے نے، کو، میں، پر، تک، سے وغیرہ) یہ "لاائقے" نہیں ہیں بلکہ مشتعل لفظ ہیں۔

ہونے والے ایک اسم کی صرف دو صورتیں ہوتی ہیں اور فاعلی اور مفعولی حالت میں ان دونوں میں سے ہر صورت ممکن ہے یا یوں کہئے کہ فاعلی اور مفعولی حالت کے ساتھ کوئی ایک صورت مخصوص نہیں۔ پس اسم کی حالتوں کے جو نام سنہ کے لئے رکھے گئے ہیں وہ اُردو کے لئے کام نہیں دے سکتے۔

اس مختصر مقدمہ کے بعد اب دیکھنا چاہئے کہ اُردو میں اسم کی کیا حالتیں مقرر کی جاسکتی ہیں اور ان کے استعمال کے کیا قاعدے ہیں۔

اُردو میں احوالِ اسم

اُردو میں اسم کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں : (۱) قائم اور (۲) محرف۔

(۱) جب کسی اسم کے بعد کوئی حرفِ ربط (یعنی حرفِ منوی یا عامل) نہ آئے تو وہ اسم اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا ہے۔ اسے ہم ”قائم حالت“ کہتے ہیں۔

(۲) جب کسی اسم کے بعد کوئی حرفِ ربط آئے تو اس کے آخر میں کسی آواز کا بدل جانا یا بعضی آوازوں کا اضافہ ہو جانا ممکن ہوتا ہے۔ اسے ہم ”محرف حالت“ کہتے ہیں۔

جنس - حالت اور عدد کے لحاظ سے اسم کی چند گردانیں ممکن ہیں۔

(۱) مذکر اسموں کی گردانیں یہ ہیں:-

پہلی گردان

حالت	واحد	جمع
قائم	بیل	بیل
محرف	بیل	بیلوں

اس گردان میں وہ تمام مذکر اسم داخل ہیں جو الف یا اس کے کسی ہم آواز حرف پر نہیں ختم ہوتے۔ جیسے ہاتھ،

کان، پان، بال، سال، پھول، پیٹ، پانو، گانو، نام، کام، پھل، بھید، چھید، تیر، پیر، پیر، بیس، سراب، گرداب، فراق، قزاق، جنگل، دنگل، آنچل، بادل، کنول، رنگ، ڈنگ، خدنگ، رنگ

لہذا کی حالت میں آخر کا نون غنہ گر جاتا ہے یعنی محض ”بیلو“۔

ننگ ، چور ، مور (پرنده) ، اور چھور ، جھاڑ ، پہاڑ وغیرہ۔

جو ، پیرُو ، نو ، سو وغیرہ۔

آرُو ، آلو ، آندُو ، آسو ، اُچُو ، اُلو ، بازُو ، بچُو ، بھرُجو ، چلو ، رفُو ، زانو ، قابو ،
بابُو ، بابُو ، شَبُو ، اُگلُ خیرُو ، چا تو ، جادُو ، کھو (ایک قسم کا زرد پتھر) ، ہندُو ، ستُو ، سنبھالُو
وغیرہ۔

پانی ، جی ، دہی ، گھی ، موتی ، دھوبی ، دُرزی ، گندمی ، آرٹھی ، بادرچی ، توپچی ، غبارچی
بچگی وغیرہ۔

فائدہ۔ اسی گردان میں وہ مذکر اسم بھی داخل ہیں جو تو (یعنی لپن یا ساکن واوِ علت) یا تو (یعنی معرّف
واو) یا تِی (یعنی معرّف یے) پر ختم ہوتے ہیں ؛ البتہ ان میں اتنا تغیر ہوتا ہے کہ جب حالتِ محرّف (جمع) میں دل
اُن پر بڑھایا جاتا ہے تو اسم کے آخر کا طویل حرفِ علت خفیف ہو جاتا ہے ؛ جیسے پیرُو سے پیرُوں (د پیرُوں) یا آلو
سے آلوں (د آلُوں) ؛ دھوبی سے (د دھوبِ عوں) وغیرہ۔ حقیقت میں یہ تغیر محض آوازوں کے باہمی
رُبط یا تناسب پر مبنی ہے ؛ اسی لئے اس میں کسی جنس کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ مونث اسموں میں بھی بعینہ ہی تغیر واقع
ہوتا ہے ، جیسے لڑکی سے لڑکیاں (د لڑکِ یاں) ، اور لڑکیوں (د لڑکِ یوں) وغیرہ۔

دوسری گردان

حالت	واحد	جمع
قام	بکرا	بکرے
محرّف	بکرے	بکروں

سوائے ان اسموں کے ، جن کا ذکر تیسری گردان میں آئے گا ، اس دوسری گردان میں وہ سب مذکر اسم داخل ہیں جو

لے واو ہمیشہ حرفِ علت نہیں ہوتا بلکہ کبھی حرفِ میم بھی ہوتا ہے ؛ جیسے وارث ، جواب ، سمو ، وہ ، والا وغیرہ میں یہی حال ہے ؛ کبھی بے
لے ، دتی ، تے ، وغیرہ میں حرفِ علت ہی اور یہ ، کیا ، لیا ، یاد ، یا اس وغیرہ میں حرفِ میم۔
لے اُن اسموں کو بھی خارج سمجھنا چاہئے جو کسی حال میں نہیں بدلتے اور اس لئے غیر متغیر کہلاتے ہیں۔

الف یا اس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں، جیسے انڈا، بُنڈا، سُنڈا، آرہ، پردہ، زردہ، گردہ،
 دُربہ، بندہ، دیوانہ، فرزانہ، جلوہ، جلسہ، تقاضا، تماشا، ناشتا، تمغا، ماجرا، چُرچا، کمرہ، دعویٰ (دعویٰ)
 فتویٰ (فتویٰ)، چالیا، گھاتیا، جُلیا، من چلا، بت بنا، اکل کھرا، دیوان خانہ، سے خانہ، ڈاک خانہ، اداست خانہ
 تجربہ خانہ، ندیدہ، آب خورہ، آب دانہ (- آب ودانہ)، آب خاصہ وغیرہ اور اُردو کے مصدر جیسے لکھنا، آنا، کھانا وغیرہ
 فائدہ ۱۔ جُزائی نام جو خفیف ہ پر ختم ہوتے ہیں۔ اسی گردان میں شامل ہیں جیسے آگرہ، کلکتہ، کوئٹہ، بصرہ، جدہ،
 سکندرہ، بانڈہ، گونڈہ، ہوبہ، سُنڈلہ، پُچھریٹھ، گلبرگہ، گولکنڈہ، مکہ، مدینہ، مُغل پُوردہ، توبہ، دجلہ،
 مگر افریقہ، قاہرہ اور قسطنطنیہ۔

فائدہ ۲۔ آں پر ختم ہونے والے لفظوں میں اے کی جگہ آں بڑھایا جاتا ہے۔ جیسے دھواں سے دھوئیں
 کُنواں سے کُنویں، ساٹواں (ایک غلہ) بھلاواں، روایاں (یا رواں یعنی چھوٹا بال) سے ساتویں، بھلا دیں،
 روئیں، پاتچواں سے پاتچویں، ساٹواں سے ساتویں، آٹھواں سے آٹھویں، نواں سے نویں، دسواں سے
 دسویں وغیرہ۔

لیکن وہ لفظ اس زمرے میں داخل نہیں جن کا نوں صرف شعر میں غنہ پڑھا جاسکتا ہو اور نثر میں ہمیشہ ٹاہرہ بیٹے
 صر سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔

تپسری گرداں

حالت	واحد	جمع
قائم	دُریا	دُریا
مُحَوَّر	دُریا	دُریاؤں

اس گردان میں وہ تمام مذکر اسم داخل ہیں جو باوجود الف یا اس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہونے کے وہ ہری

سے یاد رہے کہ مصدر جب اسم جامد کے طور پر استعمال نہ کیا جائے تو اس کی جمع نہیں آتی۔

سے ان کی جمع ممکن نہیں۔ واحد اگرے سے کلکتہ تک، کوئٹہ سے بھرے تک، بدے میں وغیرہ، مٹوؤں (جہاں وقت بولا پڑی دوازے اور دسینے (ذوق)
 سے پُرانی زبان میں سماں وہ وقت) سے سہیں آتا تھا جیسے (مہر) سے ایک زمانے میں دل کی خواہش تھا۔ ایک ستیں میں جگر کی کاہش تھا۔
 مگر اب "سماں میں" بولتے ہیں۔ اہل اس لفظ کی ہندی سے समस (اب بھی تھے بولتے ہیں۔ اور غیر)

گردان کے مطابق نہیں گردانے جاتے۔ اُن اِہوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) لقب، مُمدوں کے نام وغیرہ، جیسے آغا، آقا، خواجہ، راجا، رانا، مُراجا (مہاراجا)، بھیا، لالا، ملا، خلیفہ، مولا، مولانا، مہرزا (مُرزا) آغا مینا وغیرہ۔

(۲) رشتوں کے وہ نام جن سے چھوٹے، بڑوں کو پکارتے ہیں: جیسے ابا، بابا، باوا، دادا، نانا، چچا، تایا، چچیا، ماما (یعنی ماموں) آکا، پتا۔

(۳) غیر زبانوں کے اِسم فاعِل اور مرکب جوالف پر ختم ہوتے ہیں بہ شرطے کہ وہ اُردو میں بالکل مکمل نہ گئے ہوں۔ جیسے کارفزا، طلم کُشا، بادنما، قُطب نما، قِبلہ نما، حرارت پُما، دانا، پنا، یکتا، آشنا، شناسا، آہن رُبا، کاہ رُبا (کربا)۔

(۴) غیر زبانوں کے چُنْد اِسم (جو کسی عام تعریف کے تحت میں نہیں آتے) خدا، ہما، دریا، صحرا، زنا، عُنفا۔ سہا۔

غیر منصرف مذکر اِسم

یہ مذکر اِسم کسی حالت میں نہیں بدلتے:-

(۱) مردوں کے نام، خطاب، تخلص وغیرہ، جیسے زکریا، کلا، علم، عبیدہ، بشیر، شفیع، مسیح، مرتضیٰ، مصطفیٰ، ابوہریرہ، ذوالرّمہ، عیسیٰ، موسیٰ، چھیدا، مُحبِشُم الدّولہ، نواب دولہا، انشا، ذکا، سخا، سودا، منیا وغیرہ۔

(۲) ملکوں، شہروں، دریاؤں، پہاڑوں اور دیگر غیر ذی رُوح چیزوں کے نام جوالف پر ختم ہوتے ہیں جیسے ایشیا، امریکا، برما، بنگالا، بلحا، مینا، حما، بلیا، پروشیا، صنعا، گلیا (شہر) متھرا، کسپا، کالکا،

۱۔ بعض لوگ دادے اور دادوں اور راجے اور راجوں بولتے ہیں لیکن یہ صورتیں غیر فصیح ہیں۔
۲۔ اس لفظ سے چھوٹوں کو بھی مخاطب کرتے ہیں ۳۔ بعض لوگ جمع خوف کی حالت ملکوں اور ملکینوں بھی بولتے ہیں۔
۴۔ یہ ظاہر ہے کہ علم، تخلص، خطاب وغیرہ کی جمع نہیں آسکتی۔
۵۔ ظاہر ہے کہ علم، خطاب، تخلص وغیرہ کی جمع نہیں آسکتی۔

ہمالیا، سینا (طور)، گھاگرا، نربدا، الحمرا وغیرہ

فائدہ۔ نئے ناموں کو الف کے ساتھ لکھنا چاہئے بہ شرطے کہ وہ غیر منصرف ہوئے جائیں، جیسے افریقا،

آسٹریلیا، اڈمبرا، ایتالیا، رومانیہ، بلغاریہ وغیرہ۔

(۳) غیر زبانوں کے الف پر ختم ہونے والے لفظ جو اردو میں ابھی تک جذب نہیں ہوئے یا جو جذب نہیں ہو سکتے

جیسے اجرا، اخفا، اتقا، اثنا، احیا، اختراع، اقبرا، اقتدا، اقصا، استننا، استنزا، انخوا، افشا، ایلا، ایفا، ایما، سما، منشا۔

فائدہ۔ اس قسم کے بعض لفظ ہیں جن کو متقدمین نے غیر منصرف استعمال کیا ہے اس لئے کہ ان کے زمانے تک وہ

لفظ اردو میں پوری طرح ممکن نہ ہوئے تھے اور وہی لفظ اب بچوں کے اردو میں کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں، منصرف ہوئے جاتے ہیں، جیسے تقویٰ، تقاضا وغیرہ۔

چنانچہ غالب نے کہا ہے :-

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے

ہیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

اور آج بھی بعض لوگ ”منشاء کا“ اور ”فتویٰ کا“ بولتے ہیں اور بعض لوگ ”منشی کا“ اور ”فتوے کا“

وغیرہ۔

(۴) ایسے لفظ جن سے پہلے یا جن کے بعد فارسی کا کسرہ اضافت یا عربی کا آل یا فارسی یا عربی کا عطف ہو

وہ اردو کا کوئی تغیر یا صرف قبول نہیں کرتے، جیسے جوہر آمینہ، حُسن تقاضا، جوہر اندیشہ، دلِ دیدہ، تقاضا حُسن

ظاہر ہو کہ علمِ خطابِ شخص وغیرہ کی جمع نہیں آ سکتی ۲۵ ان میں سے اکثر لفظ ایسے ہیں کہ حقیقت میں الف پر نہیں بلکہ ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں، ۲۶ جنابِ حسرت موہانی کا یہ کہنا بجا نہیں کہ یہاں تقاضے کا ”کی جگہ“ تقاضا کا بالکل بے قاعدہ استعمال کیا گیا ہے“ (شرحِ دیوانِ غالب - مقدمہ ص ۱۵) اسی طرح غالب نے ایک اور لفظ کو بھی استعمال کیا ہے اور وہ لفظ بھی اردو میں غیر زبانوں ہی اور صرف شمس شاذ و نادر استعمال ہو کر

۲۷ آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے ۲۸ نقشِ پاؤں کان میں رکھا ہے اُٹھکی جاوہ سے

یہاں ”جاوہ سے“ نہیں پڑھا جاسکتا۔ اس پر مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نے اپنی شرح (طبع دوم ص ۲۵۲، ۲۵۳) میں وہی حسرت والا اعتراض کیا ہے مگر اس غیر کی رائے میں اساتذہ کے کلام پر اعتراض کرنے سے پہلے اُس سے استفادہ کرنا چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ جب غیر زبانوں کے لفظ کسی زبان میں پہلے پہل آتے ہیں تو اکثر وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہتے ہیں اور جب انہی زبان میں پوری طرح ممکن ہوتا ہے تب وہ اُنسی زبان کے لفظ کی طرح گودا لے جانے لگتے ہیں اور میں لفظ بڑی سہولت سے

قافلہ سالار ، سالار قافلہ ، امیر القافلہ ، دارالاملا ، بیت الخلا وغیرہ۔

فائدہ۔ عربی کے بعض ایسے مرکب جو اردو میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں مُنصرف بھی نہیں بشرطے کہ وہ محققانہ پر ختم ہوتے ہیں۔ جیسے ”دارالترجمہ میں“ ، دارالاقامے سے وغیرہ۔

(۵) غیر زبانوں کی جمع، جیسے انبیاء ، اولیاء ، علما ، طلبہ ، مرضی ، ڈیٹا (Data) ، فوٹونا (Phenomena) وغیرہ۔

فائدہ۔ انبیاءوں ، اولیاءوں ، علمائوں غلط اور غیر فصیح صورتیں ہیں۔ فارسی کی جمع اردو میں بالکل مسترد ہے صرف فارسی ترکیبوں میں استعمال ہوتی ہے ، البتہ لفظ ”صحابان“ کبھی کبھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا بھی ترک اولیٰ ہے۔

(۶) کوئی لفظ یا جملہ جب خود مقصود ہو جیسے کرنا سے بہت سے صیغے مشتق ہیں۔

ایسے لفظوں کو ہمیشہ قولِ نشانوں یا قوسین میں رکھنا چاہئے یا ان پر خط کش دینا چاہئے۔

۱۰۲۔ مونث اسم کی تصریف نسبتہ آسان ، اس لئے کہ تمام واحد مونث اسم غیر منصرف ہیں یعنی واحد کی دونوں حالتوں قائم اور محرف میں لفظ کی صورت ایک ہی رہتی ہے۔
مونث اسموں کی گردانیں یہ ہیں :-

پہلی گردان

حالت	واحد	جمع
قائم	ناک	ناکیں
محرف	ناک	ناکوں

اس گردان میں وہ تمام مونث اسم داخل ہیں جو حی یا یا پر نہیں ختم ہوتے ، جیسے آب (چمک ، دھک ، رونق)

تاب ، چوب ، شراب ، طباب ، بھاپ ، تھاپ ، توپ ، چاپ ، سپ ، آفت ، آنت ، بالیت ، دوت ، بناوٹ ، بھانج ، شہربنج ، اُتھج ، آئنج ، اصلاح ، اصطلاح ، شرح ، پانچ ، اُسید ، نوید ، تلوار ، جاگیر ، بھڑ ، تجوڑ ،

لہذا کی حالت میں یہ نون ہمیشہ گر جاتا ہے۔

نماز، نیاز، پیاس، بھینس، آزمائش، جوارش، حُص، بیاض، شرط، اطّلاع، تیغ، ردیف، خندق، چھنک
آکھ، ٹانگ، چھلانگ، جھیل، بھاگل، دپل، شہر مال، اُفم، شام، شبنم، ران، شان، کان (=مندن)
آہ، انواہ، بانہ، تمہا، راہ، کلاہ، نگاہ، چاے، راے، مراے، گاکے وغیرہ۔

ابتدا، ادا، اشتہا، اُتجا، انشا، بیٹا، بیٹو، بقا، بقایا، بچھوا، پُرودا، تننا، جاترا، جفا، جلا،
جنا، حیا، رجا، سبھا، منرا، شفا، ضیا وغیرہ

آرزو، ہو، بدو، جُتو، جو، تو، خو، خوشبو، جھاڑو، رو (مطابقت) رو، بدرو، ہو، لو،
شے، تے، مے، نے، لے۔

فائدہ ۱۔ جو مونث لفظ الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں اُن کو بھی اسی گردان میں شامل
سمجھا جائے البتہ ضرورتِ صوتی کی بنا پر جمع کی صورتوں میں فقط یں یا وں نہیں بلکہ عین اور وں اصل لفظ میں بڑھاتے
ہیں۔ جیسے ہوائیں، ہواؤں، دوائیں، دواؤں؛ بیسوائیں، بیسواؤں؛ بیوہ سے بیوائیں اور بیواؤں
واہ سے دایاں اور دایاؤں، تجمبے سے تجمبائیں اور تجمبائوں وغیرہ۔

فائدہ ۲۔ جو مونث لفظ ڈ پر ختم ہوتے ہیں وہ بھی اسی گردان میں داخل ہیں اور اُن میں بھی جمع کی صورتوں
میں عین اور وں بڑھاتے ہیں جیسے آرزو عین اور آرزو وں۔ ہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹھیٹ اُردو لفظ ہوتو
ڈ کی آواز جمع کی دونوں حالتوں میں قصیر رہ جاتی ہے یعنی ہتو سے ہتو عین (= بَہ عین) اور ہتو وں (= بَہ وں)
اور جھاڑو سے جھاڑو عین (= جھاڑو عین) اور جھاڑو وں (= جھاڑو وں) بخلاف اس کے غیر زبانوں سے جو لفظ اُردو
میں آگئے ہیں اُن کی ڈ کی آواز پوری یعنی طویل ہی رہتی ہے (مقابلہ کرو۔ مذکر کی پہلی گردان فائدہ ۱)

فائدہ ۳۔ لپن و آو یا لپن ہی پر ختم ہونے والے لفظوں کے آخر میں جو و یا ہی ہو جمع کی صورتوں میں اُس
کی آواز بھی ہمیشہ قصیر ہو جاتی ہے جیسے بدرو سے بدرو عین، پتو سے پتو عین، تو سے تو عین، تے سے تیں

دوسری گردان

وغیرہ

حالت	واحد	جمع
قائم	بکری	بکریاں

اس گردان میں وہ سب مُونْثِ اِسْمِ داخل ہیں جو مُوَرَّفِیٰ پر ختم ہوتے ہیں؛ جیسے بلی، ٹوپی، جھولی، کُرتی وغیرہ۔

تیسری گردان

حالت	واحد	جمع
قائم	دُبیا	دُبیاں
مُحَرَّف	دُبیا	دُبیوں

اس گردان میں وہ سب مُونْثِ اِسْمِ داخل ہیں جو یا پر ختم ہوتے ہیں، جیسے بُرْصیا، ٹھُلْیا، دُکھیا، دُبیا، چُمیا، پڑیا وغیرہ، مگر غیر زبانوں کے لفظ اس گردان میں نہیں بلکہ پہلی گردان میں داخل ہیں جیسے آسیا، ضیا، حیا وغیرہ۔

فائدہ تیسری گردان کے لفظ عموماً اِسْمِ تَصْغیر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غیر زبانوں کے مُونْثِ اِسْمِ جو یا پر ختم ہوتے ہیں مگر اِسْمِ تَصْغیر نہیں اس گردان کی تحت میں نہیں آتے۔

فائدہ ۱۔ ایسے مرکب لفظ جن کے آخر کا بُز دَار دَانَ یا دَالَا ہو تو پہلے بُز کی مُحَرَّف حالت پر (نہ کہ قائم حالت پر) دُوں بُز داخل کیا جائے گا جیسے تھانے دار، ٹھیکے دار، مَرے دان، بکرے دالا، بکری والا، بکروں والا بکریوں والا۔

اب ان گردانوں پر ایک نظر ڈالئے تو آسانی سے حسب ذیل گلیے اور بُزِ عے قائم کئے جاسکتے ہیں:-
(۱) جمع (چاہے مذکر یا مُونْث کی کسی گردان سے ہو) مُحَرَّف حالت میں ہمیشہ دَل (اور ندائی حالت میں تو) پر ختم ہوتی ہے۔

(۲) تمام مُونْث لفظ (چاہے کسی گردان کے ہوں) واحد مُحَرَّف میں کوئی تَیْر قبول نہیں کر سکتے۔ یعنی قائم اور مُحَرَّف

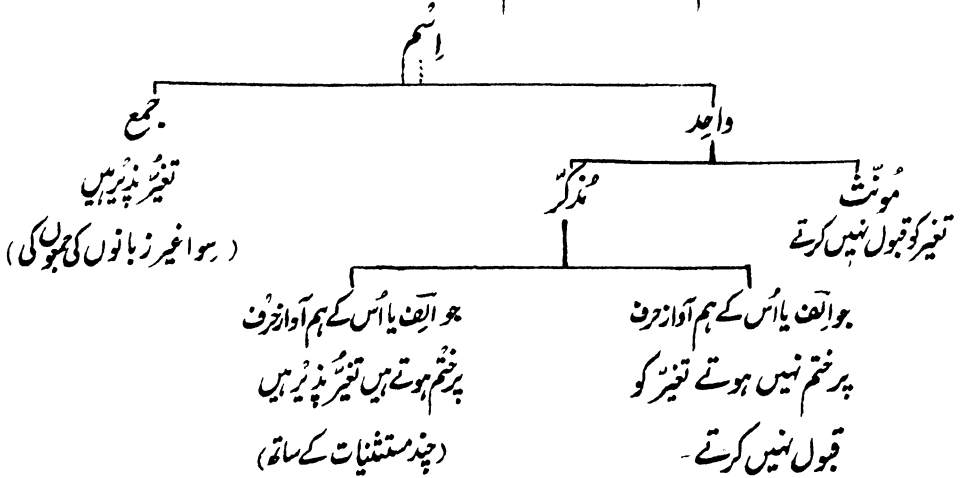
دونوں حالتوں میں اُن کی صورت ایک ہی رہتی ہے۔

(۳) تمام مذکر لفظ جو الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم نہیں ہوتے واحد محرف اور جمع قائم میں ملنے کسی قسم کا تغیر نہیں قبول کرتے، صرف جمع محرف میں تغیر قبول کرتے ہیں (جس کا ذکر فقرہ ایس ہو چکا ہے)

(۴) جو مذکر لفظ الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں واحد محرف اور جمع قائم میں اُن کا حرف بدل کرتے ہو جاتا ہے؛ جیسے لڑکا سے لڑکے، بندہ سے بندے، دعوٰی سے دعوے، ضلع (مزلہ) سے ضلع (مزلے)، قلم سے قلمے، مضرعہ سے مضرعے

(۵) بعض مذکر لفظ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر ختم ہوتے ہیں پھر بھی کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، ایسے لفظوں کو ہم غیر منصرف کہتے ہیں۔

اس شعبے سے معلوم ہو گا کہ کون سے اسم کماں تک تغیر کو قبول کرتے ہیں۔



۳۱ صفت کی گردان

صرف وہ صفتیں منصرف ہیں جن کا مذکر الف یا اُس کے کسی ہم آواز حرف پر اور جس کا مؤنث ہی پر ختم ہو۔
ایسی صفتوں کی گردان کی صورت یہ ہے:-

لے آؤ دو میں میں شدہ مطلق آواز سے نہیں بولا جاتا۔ اُس سے پہلے اگر زبر ہو تو الف کا اور زیمہ ہو تو سے کا ہم آواز ہوتا ہے تحریر میں اُسے سے سے بدلنے کا رواج نہیں ہے لیکن پُر مضبوطی سے اس کی آواز بالکل الف یا سے کی سی ہوتی ہے،

۲۴۸ مذکر

حالت	واحد	جمع
قائم	اچھا (لڑکا)	اچھے (لڑکے)
مُحَوَّر	اچھے (لڑکے)	اچھے (لڑکوں)

مُؤنث
(غیر منصرف)

حالت	واحد	جمع
قائم	اچھی (لڑکی)	اچھی (لڑکیاں)
مُحَوَّر	اچھی (لڑکی)	اچھی (لڑکیوں)

اس گردان میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جو ٹھیک اُردو کی ہیں۔

فائدہ! غیر زبانوں کے جو لفظ اُردو میں صفت کے طور پر مستعمل ہیں وہ غیر منصرف ہیں جیسے اعلیٰ، اُدنی، عمدہ، گستہ، اُفتادہ وغیرہ۔ اُن میں سے جب کوئی لفظ کسی اسم کے ساتھ صفت کے طور پر آئے تو اُس کی جُس عدد یا حالت کا کوئی اثر صفت پر نہ پڑے گا۔ یعنی اُدنی (= اونا) درجہ، اعلیٰ (= اعلیٰ) ہستی، عمدہ چیز، زیادہ مقدار، وغیرہ بولیں گے۔ عمدی، عمدے؛ زیادہ، زیادے؛ ادنیٰ، ادنے وغیرہ غلط صورتیں ہیں۔

ایک فارسی کا لفظ تازہ اس قاعدے سے مُشتقی ہے؛ اگر اِئم (موصوف) عربی یا فارسی لفظ ہو تو اس کی صفت ”تازہ“ غیر منصرف ہوگی، جیسے تازہ حال، تازہ خبر، تازہ شہر نی، لیکن اگر موصوف ایک ہندی لفظ ہو تو اُس کی صفت ”تازہ“ کی گردان اسی طرح ہوگی۔ جیسے ”اچھا“ کی۔ یعنی تازی روٹی، تازے پانی میں، تازی ملائی، تازی مٹھائی، تازی ربڑی وغیرہ۔

عربی لفظ خاص سے اُردو والوں نے ”خاصا“، ”خاصی“، ”خاصے“ بنایا جس کے معنی ہیں ”اچھا، پورا“۔ اُس کی گردان اُردو صفتوں کی طرح ہوتی ہے یعنی ”خاصا“، ”خاصی“، ”خاصے“ وغیرہ اسی طرح ایک اور عربی لفظ ”بعض“ ہے جس پر بھی الف، ی، و وغیرہ بڑھا کر اُردو صفت کی طرح گردانی ہے؛ بعضا یعنی بعضے بعضوں۔ اکثر تو کہتے ہیں کہ بعضا یعنی بعضے تو ہندیوں کا اختراع ہے

اور اب متروک ہے۔ لیکن اس فقیر حقیر کی رائے میں ان لفظوں میں کوئی عیب نہیں کیوں کہ اُردو کے مُستند اُستادوں نے ان کو استعمال کیا ہی اور ان کا یہ استعمال اُردو زبان کے موافق ہے۔

فائدہ ۲۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اُردو کی بعضی صفتوں کے آخر میں نسبت کی سی ہوتی ہے اور یہ تانیث کی سی کی طرح بدلتی نہیں۔ جیسے کھاری، بھاری۔ اس لئے ”کھارا پانی“ اور ”بھارا صندوق“ غلط ہوگا۔ ”کھاری پانی“ اور ”بھاری صندوق“ کہنا چاہئے۔

مُکَلِّیّہ۔ صفت اگر جابد اسم کے طور پر استعمال ہو تو اس کی کیفیت بالکل اسم کی سی ہوگی، جیسے اچھوں کے اچھو ہی ہوتے ہیں، ہم تو بُروں کی جان کو پہلے ہی روچکے، اپنے پیاروں کا صدقہ دو وغیرہ۔
۴۔ مرکب صفت کی گردان۔

مذکر

حالت	واحد	جمع
قائم	لکھا ہوا (خط)	لکھے ہوئے (خط)
مُحَرَّف	لکھے ہوئے (خط)	لکھے ہوئے (خطوں)

اسی طرح دوڑتا ہوا (گھوڑا) دوڑتے ہوئے گھوڑے نے ٹھوکر لی، گھبرایا ہوا شخص، گھبرائے ہوئے آدمی سے کیا ہو سکتا ہے، لکھے ہوئے کاغذوں کو ضائع نہ کرنا۔

مؤنث

حالت	واحد	جمع
قائم	پھٹی ہوئی (کتاب)	پھٹی ہوئی (کتابیں)
مُحَرَّف	پھٹی ہوئی (کتاب)	پھٹی ہوئی (کتابوں)

فائدہ۔ مرکب صفت اگر جابد اسم کے طور پر استعمال ہو تو اس کی گردان یوں ہوگی۔

حالت	واحد	جمع
قائم	بھولا ہوا	بھولے ہوئے

مُحَرَّف

بھولے ہوئے

بھولے ہوؤں

اسی طرح: ”لکھے پڑھوں سے ایسی غلطی پیدا ہے“ مگر لکھے پڑھے لوگوں سے ایسی غلطی پیدا ہے۔

مُونِث

ایسی مرکب صفتیں جن کا آخر جز ”ہوئی“ ہو عموماً اسم جامد کے طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔ اس لئے مونث کی کوئی گردان قائم نہیں ہو سکتی۔

۱۵۔ ضمیر کی گردان

وہ ضمیریں جن کا ذکر اَلَف پر اور جن کا مونث تہی پر ختم ہوتا ہے صفت کی طرح گردانی جاتی ہیں۔ جیسے تیرا، تیری، میرا، میری، تمہارا، تمہاری؛ ہمارا، ہماری، اپنا، اپنی اور یہی حال ہے کا، کی اور سا، سی اور ایسا، جیسا، کیسا، ویسا کا۔ اگر ایسی کوئی ضمیر اسم کی جگہ پر استعمال ہو تو اُس کی گردان اسم کی سی ہوگی۔

(۲) جو ضمیریں اَلَف یا تہی پر ختم نہیں ہوتیں اُن میں جنس کی کوئی تمیز نہیں، صرف عدد کا امتیاز ہے۔ اُن کی گردان

یہ ہیں۔

حالت	واحد (مذکر اور مونث)	جمع (مذکر اور مونث)
قائم	وہ، یہ، جو، کون، کیا	وہ، یہ، کون، کیا
مُحَرَّف	اُس، اِس، جس، کس اُسے، اِسے، جسے، کسے (یعنی اُس کو، اِس کو وغیرہ)	اُن، اِن، جن، کُن۔ اور صرف نے سے پہلے اُنھوں، اِنھوں، جنھوں، کُنھوں، اُنہیں، اِنہیں، جنہیں، کُنہیں، (اُن کو اِن کو وغیرہ)
قائم	تو، میں	تم، ہم

۱۔ قدیم زبان میں ان صورتوں کے ساتھ تے کی تحفہ نہ تھی یعنی نول کو، انھوں سے وغیرہ بولتے تھے۔ ”سب“ کے لفظ کے ساتھ جب کوئی عامل آتا تو سبھوں یا سبھوں استعمال کرتے تھے۔ لیکن اب متروک ہے۔ اور ”سب“ غیر منفرد ہے۔

مُحَرَّف

(سوارِ اضافی کے)

تُجھ ، مُجھ تُم ، ہُم
تُجھے ، مُجھے (تُجھ کو ، مُجھ کو) تُمھیں ، ہُم (تُم کو ، ہُم کو)

تیرا ، میرا (تیری ، میری مَوٹ) تُمھارا ، میرا (تُمھاری ، میری مَوٹ)

اضافی

”کوئی“ مُحَرَّف حالت میں کسی“ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب عدد ، مقدار ، وقت وغیرہ کا تخمینہ بیان ہو تو ”کسی“ نہیں آتا بلکہ مُحَرَّف حالت میں بھی ”کوئی“ ہی استعمال ہوتا ہے؛ جیسے ”یہ کپڑا کوئی دو روپے کا ہوگا“، ”کوئی دم میں سارا حال معلوم ہوا جاتا ہے“ وغیرہ

ہُ مُتَعَلِّقِ فَعْلٍ اور حُرَف کی گردان

- (۱) بعضے اُتم یا صفتیں وغیرہ اپنی مُحَرَّف صورتوں میں مُتَعَلِّقِ فَعْلٍ یا حُرَف کا کام دیتی ہیں اور مقامِ ہمت ، طور ، سبب ذریعہ ، وقت بتاتی ہیں۔ جیسے آگے چل ، پیچھے پیٹ ، پیچھے دیکھ ، اُس کے گھر کے پچھلے اڑے ایک ام کا درخت ہے تویر کا اٹھ ، دس بجے کھانا کھا ، مے پیچھے (پر) امیر غریب سب برابر ہیں ، دہنے ، باتیں دیکھ کر چل ، سامنے آ۔
- (۲) جو حُرَف معنوی الف پر ختم ہوتے ہیں وہ بھی منصرف ہیں اور اُن کی گردان صفت کی گردان کے مماثل ہوتی ہے۔ جیسے (۱) حُرَفِ اضافت : کا ، کی ، کے ، (ب) حُرَفِ تشبیہ : سا ، جیسا جن کا بیان ضمیر کے ذیل میں آچکا ہے۔

عوامل

جن تغیرات کا اوپر بیان ہوا ان کو جو لفظ ، ترکیبیں یا کیفیتیں عمل میں لاتی ہیں ، اُن کو ”عوامل“ کہتے ہیں۔
عامل دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) لفظی اور (۲) معنوی۔

(۱) ”لفظی عامل“ اُس لفظ کو کہتے ہیں جو عبارت میں موجود ہو اور کسی دوسرے لفظ کی قائم حالت کو مُحَرَّف میں

تبیل کر دے۔

لفظی عاملوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) اضافت کے حُرَف : کا ، کی ، کے ،

(۲) ظرفیت کے حُرُف : سے ، تک ، میں ، کئے ، تِلْکے ، نیچے ، اوپر ، کے اوپر ، کے باہر

(۳) فاعلیت کا حرف : نے

(۴) مفعولیت کے حرف : کو ، سے ، کے تئیں ۔

(۵) معیت کے حرف : سمیت ، کے ساتھ ، مع کے

(۶) نداء کے حرف : اے ، او ، ارے ، اری ، اہی ۔

نداء کے حرفوں کے جواب اپنے ماقبل پر عمل کرتے ہیں ۔

(۷) ”معنوی عامل“ اُس کیفیت یا ترکیب کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی لفظ متغیر ہو (اور کوئی ایسا لفظی عامل

موجود نہ ہو جو اُس تغیر کا باعث ہو سکتا ہو)۔

معنوی عاملوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جب کوئی لفظی عامل مقدر یا محذوف ہو : جیسے اِتِّفَاقًا

اِتِّفَاقًا اِکْ اَشْنَا مِرے : گئے تھے ایک عمدہ کے دیرے (ستودا)

ترے کو پہچنے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سوا بات کرنا (مصحفی)

پہلے شعر میں (دیرے) کو ، دوسرے میں (کو پہچنے) میں اور (بہانے) سے مُقَدَّر ہیں ۔

(۲) کسی اِسم یا فقرے کا متعلق فعل ہونا : جیسے ”وہ کیسے گیا“ ، ”میں جیسے چاہوں ویسے کام کروں گا“۔

عامل کہاں تک عمل کرتا ہے

ایک اکیلے عامل کا اثر اُس کے تمام ماقبل اسموں ، مفتوحوں ، حرفوں وغیرہ پر پڑتا ہے ، جیسا کہ ان مثالوں

سے واضح ہوگا ۔

سہ متروک

(۱) وہ لڑکا آیا، یہ گھوڑا جاتا ہی۔ وہ تقریر کر رہا تھا کہ میں پہنچ گیا۔ ایک اچھا خاصا اونچا پورا جوان کھڑا تھا (ان جملوں میں چوں کہ کوئی عامل نہیں اس لئے سب ضمیریں، اسم اور صفتیں قائم حالت میں ہیں)

(۲) اُس لڑکے نے کہا۔ اس گھوڑے کو دیکھو۔ اُس کی تقریر ہو رہی تھی کہ میں پہنچ گیا۔ (ان جملوں میں نے، کو، کی موجود نہیں۔ جنہوں نے اپنی ماقبل ضمیروں اور اسموں کو محرف کر دیا ہے)

(۳) وہ آیا

اُس کا بیٹا آیا

اُس کے بیٹے کا گھوڑا آیا

اُس کے بڑے بیٹے کا گھوڑا آیا

اُس کے بڑے بیٹے کے گھوڑے کا تو بڑا لٹک رہا ہے۔

اُس کے بڑے بیٹے کے بزرے گھوڑے کا تو بڑا لٹک رہا ہے۔

اُس کے بڑے بیٹے کے بزرے گھوڑے کے تو بڑے میں دانہ نہیں ہی۔

اُس کے بڑے بیٹے کے بزرے گھوڑے کے تو بڑے میں دانہ کا نام نہیں۔

اُس کے بڑے بیٹے کے بزرے گھوڑے کے لیے تو بڑے میں پھنے کے دئے ہوئے دانے کا نام نہیں۔

رسم خط

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے جو لفظ مُختفیّہ پر ختم ہوتے ہیں واحد محرف حالت میں اُن کی مُختفیّہ بدل کرے ہو جاتی ہے۔ کتابت میں بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

”امتحان میں جتنے لمبر ایک اُمیدوار حاصل کرتا ہے اُسی کے مطابق اُس کا درجہ قائم کیا جاتا ہے۔“

”وہ دو سرے درجے میں کامیاب ہوا۔“ امتحان کی کامیابی کے تین درجے مقرر نہیں۔ بعضے لوگ بجائے ”درجے میں“ کے ”درجہ میں“ لکھتے ہیں اور جب اُن سے کہو کہ اس کو تے کے ساتھ لکھنا چاہئے تو کہتے ہیں کہ یہ لفظ تو عربی زبان کا ہے اور عربی میں تے سے نہیں لکھا جاتا، لیکن تمنا یہ ہے کہ وہی لوگ جب اُسی لفظ کو جمع میں استعمال کرتے ہیں تو تے

آواز کے مطابق کتابت نہ ہونے سے عبارت کے پڑھنے میں بعض وقت بڑی خرابی پیدا ہوتی ہے اور حسب تک پہلے مطالعہ نہ کر لے کر لچھے اس کا صحیح پڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی مثال کے لئے دو جملے کافی ہوں گے۔

(۱) ”وہ ایک بلند درجہ اور اعلیٰ خدمت پر فائز تھا“

(۲) ”طویل محاصرہ اور اُس کی گوناگوں تکلیفوں سے سارا شکر پریشان ہو گیا تھا۔“

ان دونوں جملوں میں عامل [پہ (۱) اور سے (۲)] اپنے معمول کموں [درجہ (۱) اور محاصرہ (۲)] سے دو جا کر ظاہر ہوئے ہیں اس لئے پڑھنے والا ولہ اول میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اُسے درجہ اور محاصرہ پڑھنا چاہئے یا ”درجہ“ اور ”محاصرہ“۔

ان اسباب پر نظر کر کے میری رائے تو یہ ہی کہ اگر سح پر ختم ہونے والے لفظوں کے آخر میں مُحَرَف حالت میں سے بڑھا دی جائے تو بہتر ہے جیسے ”ضیاعہ“ میں وغیرہ۔ لیکن خیر یہ نہ ہو تو نہ سہی، ”درجہ میں“ ”پردہ کے چھپے“ کا غلط رسم خط ضرور ترک کیا جانا چاہئے۔

راحتستان ہشی

[از جناب مولوی سید ہاشمی صاحب کنہارا ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن)]

قال اللہ تعالیٰ عزوجل: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اخْلُوا فِي السَّكِينِ

۱۔ آسماں میں شیشہ، میرا دیدہ خوابیدہ ہے
میں کہ اطمینان کا محروم جو یا تھا بہاں
چاہتا ہوں لطفِ تاریکی و تسکینِ خمار
بادہ اوہام میں شاید ملے کیفِ کمال
جس کے پردوں میں نہاں صد عالمِ نادیدہ ہے
خواب، میری زندگی کی فرحتِ پوشیدہ ہے
بس کہ بیداری سے میری باصرہ رنجیدہ ہے
واقعیت سر سے پاتکِ نقصِ آشامیدہ ہے
ہوش، آزادی کے حق میں بندشِ پیچیدہ ہے
مزدطیرانِ زغن یاں نعشِ ناپرسیدہ ہے
بے خطر پرواز کی ہے قدر و گنجائش کہاں

سیرِ مطلق کی تمنا ہے تو سو جاہم نشین
جسم و جسمانی سے کر لے بے خبرانی تین

۲۔ اس فضاے خواب کو گلہائے نو سے شاد کر
راحتِ بے قید کا انسان کی نقشہ بنا
یعنی تاریکی میں بستی نور کی آباد کر
نفسِ ظالم کی غلامی سے اسے آزاد کر
اس کو مغزولِ جفا، محرومِ استبداد کر
ملکِ راحت میں نہیں چلتی حکومتِ نفس کی
نفسِ امارہ کے معنی ہیں ”سرشتِ آب و گل“ ق
آب و گل کی اصلیت ہونی عدم سے یاد کر

گر وجودِ جادواں ہی جامہٴ خیر و کمال ق زیر پوشاکِ عدمِ نظارہٴ اضداد کر
 نفسِ بد ہی شور بومِ مرگ و شتر اس کھیت میں خیر بھلنے کی نہ تو اُمید بے بنیاد کر
 نفس کا محکوم رہ کر عقل و دانش پر نہ بھول
 جلنے والے کے لئے تنویر آتش ہی فضول

۳۔۔ ”راحتستان“ میں مری وہ عقل ہے بے اعتبار صحن ”معلومات“ میں جو دوڑتی ہو طفل وار!
 صیدِ نیابِ حافظہٴ مجروحِ شکِ فعلِ جوس ق ہیں ہی ارکانِ جن پر علم کا ہی انحصار
 علمِ انسانی کی اس فاسد بنا پر عقل نے کاخِ دیواں جو کئے تعمیر سب نا استوار
 جامِ حکمت میں ہے اس کے کیفِ سوفسطائیت مست و لایعقل کیا مغل کو جس نے بار بار
 پیرہنِ ہامان کا بھی زیب دیتا ہے اسے نفس کی کرے اگر دربارِ داری اختیار
 رہ نمابن کر اسے گو ٹوکتی رہتی بھی ہے درحقیقت شہسوِ نفس کی ہی راہوار
 پیروی اس مشتبہ رہبر کی آخر چھوڑ دی
 یعنی عینکِ عقل کی اہل نظر نے توڑ دی!

نفسِ بد آہنگ اور سازِ تعقل پر غفلت راحتستان کا مرے، قانون ہی حسنِ عمل!
 ہے یہی وہ دل کش و دشوار راہِ مستقیم جس کا رہرو بے خبر منزل پہ آتا ہے نکل
 ہے طلسمِ راحتستان کی کلیہٴ درہی ہے اسی میں زندگی کے راز سر بستہ کا حل
 ہے یہی وہ جنتری جس کی شکنجِ بزم میں کھینچ کے ہو جاتا ہے سیدھا نفس کا ایک ایک
 ہے یہی پودا، بہارِ جادواں ہے جس کا پھول ہے یہی وہ پٹر، عیشِ جادواں ہے جس کا چل
 ہے اسی آرائشِ طاہر کے اندر مندرج وہ سرورِ باطنی، یعنی بہشتِ بے بدل

ہاشمی کے خواب کی شاید یہی تعبیر ہو
 کیا عجب ہے راحتستان، ”سلم“ کی تفسیر ہو؟



علمِ ڈراما

(۱) یونان

(از جناب محمد عمر صاحب بی۔ اے۔ صدر مترجم لائبریری نیشنل عالیہ جموں کشمیر)

اُس زمانہ میں جب یورپ بلکہ ایشیا کے کثیر حصہ پر جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، علم و فضل کا آفتاب افقِ یونان پر چمک رہا تھا۔ فلسفہ، الہیات، ہندسہ اور نجوم سے وسیع علوم کے پہلو بہ پہلو فنونِ لطیفہ نشوونما پا رہے تھے جن کی حکمائے یونان نے آٹھ قسمیں مقرر کی تھیں (۱) ڈراما (۲) نظم (۳) خطابت (۴) موسیقی (۵) سنگ تراشی (۶) مصوری (۷) معماری اور (۸) باغبانی۔

(ڈراما یونانی لفظ Drama سے مشتق ہے جس کے معنی کام کرنے اور ایکٹ کرنے کے ہیں) یہ دراصل نظم کی ایک صنف تھا مگر رفتہ رفتہ اسے وہ اہمیت حاصل ہوئی کہ بجائے خود ایک فن بن گیا۔ خواہ اسے تفریحِ طبع کے سامان کا تقاضا کئے یا مذہبی عنصر کی برکت خیال کیجئے بہر حال ڈراما تمام دیگر فنونِ لطیفہ سے گویا سبقت لے گیا اور یونانی تمدن پر ایسا چھایا کہ بغیر اس کے ذکرِ خیر کے یونان کی تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔ ڈراما کی اقسام ڈراما افعالِ انسانی کی صحتی جاگتی متحرک نمائش کا نام ہے۔ اس میں مسلسل اور روح پرور گفتگو سے داستانِ پلاٹ پیدا ہوتا ہے اور تذکرہ یا حکایت روایہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ ٹریجڈی (داستانِ غم) اور کومیڈی (داستانِ ہجرت) اس کی دو اہم قسمیں ہیں۔

ٹریجڈی اور کومیڈی کی نوعیت ابتدا میں ٹریجڈی سے فقط رسومِ مذہبی کا انصرام مد نظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں انسان اور اس کے افعال کی آئینہ برداری اس کے سپرد ہوئی یہ عام خیال صریحاً غلط ہے کہ ٹریجڈی کا انجام لازماً کیرکٹروں کی موت پر ہونا چاہیے۔ افلاطون کے نزدیک ہر وہ سنجیدہ ڈراما جن میں دیو مالا کے کسی مہر کے مصائب کا بیان یا کسی قومی ادب یا جہان کشائی کا تذکرہ ہو ٹریجڈی ہے

ارسطو کا قول ہے کہ ”ٹریجڈی کسی کارنامہ کی سنجیدہ، متین، مکمل اور مناسب حال نقل ہے جس میں عفو و کرم اور جبر و جور کا آل دکھا کر نفس کی اصلاح و فلاح مقصود ہوتی ہے۔ ٹریجڈی کے کرکٹر سوسائٹی کے متوسط طبقہ سے بلند تر پایہ کے اور کومیڈی کے اس سے کم درجہ کے ہونے چاہئیں۔ نیک نہاد لوگوں کو مصیبت کے گرداب میں ڈالنا خواہ کتنا ہی الم ناک کیوں نہ ہو ٹریجڈی کی منزلت نہیں رکھتا اور کسی بد معاش کو اس کے کیفر کردار کو بھونچنا ممکن ہے کہ از بس سبق آموز ہو مگر اسے ٹریجڈی سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا۔ ٹریجڈی میں لا بدی ہے کہ جو بلا کسی کے سر آئے وہ قطعاً نا واجب اور غیر معمولی ہو۔ مگر باوجود اس کے حوادث کی علت غائی ایسی واضح ہو کہ جب ہم واقف ہوں تو ساتھ ہی یہ بھی محسوس کریں کہ وہ واقعہ کسی اور طریق سے یا کسی اور اسلوب پر ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔“

آر ایس کوپل سٹن بھی افسوس ناک انجام کو ٹریجڈی کے لوازمات میں شمار نہیں کرتے۔ اسے ”دلیو۔ شلگل اپنی معرکہ الآلا تصنیف موسومہ فن و ادبیات ڈراما، میں ٹریجڈی اور کومیڈی کے بارے میں کیا خوب کہتے ہیں:-

”ٹریجڈی تخیل کا معراج کمال اور کومیڈی اس کا بازیچہ ہے“

جے ایس، کلٹف، اپنی تصنیف لطیف ”ڈراما نگران برطانیہ“ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:-

”ٹریجڈی کا تعلق فطرت انسانی کے عمیق اور افضل اور حقیقت آشنا پہلو سے ہوتا ہے۔ اس کا غشاء یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو مصائب رونما ہوتے ہیں، انہیں عملی طور پر دکھا کر مہر ردی اور دل سوزی کے جذبات کو متحرک کیا جائے۔ اس کے برعکس کومیڈی میں روزمرہ کے ایسے معمولی واقعات ہوتے ہیں جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں:-

کومیڈی بنی نوع انسان کی مضحکہ خیز سہو و خطا، اس کی فروگزاشتوں اور خامیوں کو حاضرین کی تفریح طبع کے لئے پیش کرتی ہے۔ ٹریجڈی قلب انسانی کے بہترین جذبات کو متاثر کرتی ہے اور کومیڈی اپنے زدانہ اور ستانہ انداز میں مزے مزے کی چٹکیاں لیتی ہے۔ کومیڈی دکھ درد، سنجیدگی اور متانت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور ٹریجڈی عیش و نشاط، لہو و لعب، خوش طبعی اور دل لگی کی روادار نہیں۔ ٹریجڈی ان لوگوں کی حالت کا آئینہ ہوتی ہے جو تنازع بقا کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی تقدیر سے لڑائی ٹھانتے ہیں اور ملاطمت حیات میں تنگے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ کومیڈی ایسے اشخاص کا مرقع پیش کرتی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر من مانی رنگ ریاں مناتے ہیں اور

جن پر دن رات کچے گھڑے کی چڑھی رہتی ہے۔“

دورِ حاضرہ میں ٹریجڈی ایسے تذکرہ کی حامل ہے جس میں درد انگیز واقعات بیان کر کے خیالات کو بلند، نظر کو وسیع اور دل کو کشادہ کیا جاتا ہے اور کو میڈی ایسے داستانوں کی سرسایہ دار ہوتی ہے جس میں ہزل و ظرافت کے ذریعہ رسوم و عادات ذمہ کی کھلی اڑائی جاتی ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم یونانی ڈراما کی ارتقائی اور تاریخی حیثیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یونانی ڈراما کی ابتدا تحقیق کی رائے ہے کہ باقاعدہ ایجاد سے بہت پہلے اہل یونان کی طبائع میں ڈراما کا عنصر موجود تھا اور اس کی شہادت اُن مذہبی رسوم سے ملتی ہے جنہیں اسرارِ برزخ کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی پوجا تھی جس میں پوجاری ڈیمٹری Demeter اور سیرس Ceres نامی دو دیوتاؤں کے معجزات اور سوانح حیات ان کا بہروپ بھر کر بیان کرتے اور اعراف، دوزخ اور بہشت کے نظارے دکھا کر حیات بعد الموت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچتے تھے اور اُس سے تلقین و تبلیغ کا کام لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باکس پوجا رائج تھی لیکن اس میں ادائے فرائض مذہبی کے علاوہ قومی اور اقتصادی بہبودی کی دعائیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ باقاعدہ ڈراما کا سرچشمہ ہی باکس پوجا ہے۔

ڈورین اور آئی اوین یونان کی آبادی زیادہ تر دو مقتدر قوموں پر مشتمل تھی جن میں ایک کانام ڈورین (Dorian) اور دوسری کا آئی اوین (Ionian) تھا۔ اول ل ذکر ایک سرفروش اور جنگ جو قوم تھی۔ ضرب و حرب کی باتیں اُن کی طبائع میں اس قدر چمکی تھیں کہ اُن کی بزم پر رزم کا دھوکا ہوتا تھا۔ ڈورین موسم بہار کے آغاز میں باکس پوجا کا تیوہار بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے اپنے رقص و سرود پر سیاہیانہ رنگ چڑھا کر ایسا مسخ کر دیا کہ ان کا پلح فوج کا کوپچ ہو گیا اور ان کا گانا سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رجز پڑھ رہا ہے۔ ان کے گیت بالکل وحشیانہ ہوتے تھے۔ جن کی تصنیف کسی اصول

۱۔ باکس (Bacchus) لاطینی دیوتا کو یونانی ڈائیونی سس Dionysos کا مرادف قرار دیتے ہیں حالانکہ باکس صرف شراب کا دیوتا ہے اور ڈائیونی سس ان صفات کا مظہر ہے جو ہندوستانی دیوتا برہما سے منسوب کی جاتی ہیں یعنی وہ موجودات عالم کا خالق ہے۔ ۱۲

یا قاعدہ کی دست نگر نہ تھی۔ جب آئی اوین اُن کے ساتھ آباد ہوئے تو انہوں نے باکس پوجا میں اپنے گیت بھی شامل کر دیئے۔ جنہیں وہ اپنی زبان میں ڈیتی رمیب Dethyramb کہتے تھے۔ ان میں بھی تال اور سرکاشانک نہ تھا۔ جو لوگ باکس پوجا میں لپچے گاتے تھے، انہیں کورس کہتے تھے۔

ایری ان ۵۸ قبل مسیح کو رنٹھ کے ایک شاعر اور مثنوی ایری ان نامی نے ان گیتوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی
ARION اور ٹریجک کورس ایجا دکیا جن میں چند اشخاص جن کی تعداد پچاس کے قریب ہوتی تھی باکس کے حواری بنتے تھے اور بکرے کی کھالیں اوڑھ کر گاتے بجاتے قربان گاہ کا طواف کرتے تھے اس سے فارغ ہو کر ایک بکرا قربانی دیا جاتا تھا۔ اس قربانی کے بکرے اور کھالوں کے ملبوس کی نسبت سے ان گیتوں کو ٹریجڈی یعنی بکرے کا گیت کہتے تھے۔ اس طرح باکس پوجا سے ٹریجڈی نے جنم لیا۔

تھسپس ۵۳۵ قبل مسیح ۵۳۵ قبل مسیح میں یونان کے ایک سربراہ اور دہ شاعر اور ڈراما کے موجد تھسپس
THE SPIS نے باکس پوجا کا ایک نیا باب کھول کر حقیقی ڈرامہ کا ڈول ڈالا۔ کورس کے مسلسل گانے سے انقباض خاطر پیدا ہوتا تھا اور خود گویے لگاتا رہتے گاتے تھک کر چور ہو جاتے تھے۔ اس نفس کو رفع کرنے کے لئے تھسپس نے یونانی دیو بالا سے چند پلاٹ لے کر چند کہانیاں ڈراما کی طرز پر تصنیف کیں جن میں وہ خود یا کوئی اور شخص ایک چھوٹے سے تختہ پر کھڑا ہو کر تماشا یوں کو سناٹا تھا اور کورس کو دم لینے کا موقع ملتا تھا۔ ان کہانیوں کو ایپسود Episode کہتے تھے۔

فری نیکس تھسپس نے جس اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اسے وہ کماحقہ، انجام پر نہ پھونچا سکا اور اس کے
PHRYNICUS ایک شاگرد رشید فری نیکس نے اس سہل کو منڈھے چڑھانے کا تمیہ کیا۔ باکس کی رام کہانی سنتے سنتے سامعین کے کان پک گئے اور دلچسپی کا فہم ان تنافر کی حد تک پہنچنے کے قریب تھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر فری نیکس کی جدت طراز طبیعت نے باکس کے محامد کو بالائے طاق رکھ کر نو ٹریجڈیاں تصنیف کیں۔ جو یکے بعد دیگرے پہلک کو دکھائی گئیں۔ لیکن کورس برابر جاری رہا۔ کورس یا ایپسود میں ابھی تک عورتوں کو

شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ فری نیس نے اس قید کو بھی اڑا دیا اور عورتوں کو یہ فرائض تفویض ہونے لگے۔ اس زمانہ میں یونانیوں کے سر پر عجب و غرور کا ایسا بھوت سوار تھا کہ وہ کسی ایسی بات کا سنا گوارا نہیں کرتے تھے جس سے اُن کی کسرِ شان ہوتی۔ ایسے ناموافق ایام میں فری نیس کی ٹریجڈی ”گرفتاری مہوٹا مالی ٹس“ دکھائی اور سنانی گئی۔ اس ٹریجڈی میں یونانیوں پر خوب لعن و طعن کی گئی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ محفل میں کہرام مچ گیا۔ چاروں طرف سے رونے پٹینے کی صدائیں آنے لگیں اور ٹریجڈی بند کی گئی۔ مقدمہ چلا اور فری نیس پر ایک ہزار درہم جرمانہ ہوا۔ اور ٹریجڈی مذکور ضبط کی گئی۔ جب کھیل بگڑتا نظر آیا تو فری نیس نے ایک اور ٹریجڈی تیار کی اور اُس میں یونانیوں کی تعریف خوب دل کھول کر کی۔ اس ٹریجڈی نے وہ قبول عام حاصل کیا کہ معرکہ تھرماپولی کے ہیرو نے اس میں پارٹ لیا اور پھر فری نیس یونانیوں کا چاہتا شاعر بن گیا۔

ایسی کاٹی لس ASECHYLUS
یونان کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے ڈرامہ کی اصلاح میں بہت کارہائے نمایاں کئے اور جس طرح تھس پس فن ڈرامہ کا موجد ہے اسی طرح باقاعدہ ٹریجڈی کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا ایسی کاٹی لس کے سر ہے۔ اُس نے کورس کو بہت حد تک عضو معطل کر کے مکالمہ کا جزو اعظم بنایا۔ اس سے قبل صرف ایک ایکٹر اگر تقریر کر جایا کرتا تھا۔ اس نے دو ایکٹروں کا ایک وقت میں موجود ہونا لازم قرار دیا اور اس بات پر مصر ہوا کہ ہر ایکٹر اپنے کیرکٹر کی شان کے مطابق کپڑے پہن کر پیش ہوا کرے۔ یہ شاعر ٹریجڈیوں کے مصنف ہونے کے علاوہ خود ایک باکمال ایکٹر تھا۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ ایسا مہیب مصنوعی چہرہ مینہ پر چڑھا کر اپنی ایک ٹریجڈی میں پارٹ کرنے کے لئے نکلا کہ اسے دیکھ کر کئی بچے دہل کر مر گئے اور متعدد عورتوں کے حمل گر گئے۔ اس کے ڈراموں میں سے صرف ساٹھ دست برد زمانہ سے محفوظ رہے ہیں۔ باقیوں کے صرف نام رہ گئے نشان نہیں ملتا۔

اس کے ڈرامے بہت دہشت ناک اور ڈراؤنے ہوتے تھے۔ لیکن جس طرح بچے جنوں بھوتوں کی کہانیاں سن کر سہم جاتے ہیں مگر اس پر بھی انھیں شوق اور اصرار سے سنتے ہیں۔ یہی صورت ان ڈراموں اور اہل یونان کی تھی۔ دینی پیشواؤں کی تصنیع و تذلیل اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سربازاہ انھیں جلی کٹی سنا تا اور ان کی نقلیں بنا کر سوا کرتا پھرتا تھا۔ ایسی کالمس نہ صرف شاعر غرا اور نامور ایکٹر تھا بلکہ قلم کی طرح اس کی مٹو بھی

جب چلتی تھی تو قیامت برپا کر دیتی تھی لیکن جب ٹریجڈی نویسی کا انعام ایک پبلک جلسہ میں اس کے حریف اور ہم عصر شاعر سوفوکلز کو دیا گیا تو ایسی کائی پس دل برداشتہ ہو کر کہیں چلا گیا۔

سوفوکلز Sophocles ڈرامہ میں ابھی بہت کچھ مزید اصلاح کی ضرورت تھی اور یہ کام قدرت نے سوفوکلز کے لئے ودیعت کر رکھا تھا۔ اس نے یونانی اسٹیج پر بے شمار نئی باتیں رائج کیں

اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اسٹیج پر ہمیشہ بجائے دو کے تین ایکٹرموجود ہوا کریں اور ان کا لباس پر تکلف ہو۔ سوفوکلز نے ۱۶ سال کی عمر میں ڈراما نگاری شروع کی اور کل ایک سو تیس ڈرامے لکھے۔ سوفوکلز نے اوڈےس Oedipus کے متعلق جو تین ٹریجڈیاں لکھیں وہ اس لحاظ سے قابل غور ہیں کہ ان کا اثر یورپ کے ڈراما پر پڑا۔ اوڈےس پس کی ٹریجڈی میں یہ کہانی ہے کہ ایک بیٹا اپنی سگی ماں سے شادی کر لیتا ہے۔ اور اپنے بیٹوں کا بھائی اور باپ، اپنی ماں کا خاوند اور بیٹا اور اپنے باپ کا رقیب اور قاتل بن جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یونانی جو تہذیب کے مشعل ڈراما ہونے کا دم بھرتے تھے کس طرح اس قابل نفرت ٹریجڈی کی نمائش کو روا رکھتے تھے۔ ہمارے تعجب کی کوئی

انتہا نہیں رہتی جب ہم خود ارسطو کو اس ٹریجڈی کی تعریف میں رطب اللسان پاتے ہیں جو اسے ٹریجڈی کا بہترین نمونہ قرار دیتا ہے۔ لیکن ان سب بڑے بڑے حکیم و ائمہ کی رائے کہ روم قدیم میں سینکا، منڈب فرانس میں و البیٹر اور ثقافت پسند انگلستان میں ڈرائیڈن جیسے برگزیدہ آدمیوں نے اسی مضمون کی ٹریجڈیاں لکھنے پر فخر کیا ہے

آسٹریا کے مشہور سحر نگار اور زمانہ حال کے سربراہ اور وہ ڈراما نویس ہو گو فان ہوم منشتال Hugo Von Hofmannsthal کی تاج شہرت کا سب سے زیادہ چمکدار الماس ہی کو میڈی ہے۔ سچ ہے کہ تہذیب کا کوئی معیار نہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سوفوکلز نچا شہدا تھا، بلکہ اس کے چلن کی پاکیزگی پر کوئی حرف نہ رکھ سکتا تھا سوفوکلز نے عالم پیری میں بھی قلم ہاتھ سے نہ چھوڑا اور برابر ٹریجڈیاں لکھتا رہا۔ جب اس کی عمر سو سال سے تجاوز کر گئی تو اس کے ایک ناخلف بیٹے نے یہ تمہت تراشی کہ اس کے جو اس میں خلل آگیا ہے۔ سوفوکلز نے عدالت کے روبرو اپنی جواب دہی میں اوڈےس کی تیسری جلد جو اس کی تازہ تصنیف تھی پیش کی اور عدالت نے قرار دیا کہ جو شخص ایسی کتاب تصنیف کرنے پر قادر ہے اسے کوئی پاگل ہی محضوں کے گا۔

یورپیڈیز اس زمانہ میں یورپیڈیز شاعر نے بھی علم اُستادی بلند کر رکھا تھا۔ حکیم سُقراط سے اس کے (EUREPIDES) تعلقات دوستانہ تھے۔ جس حکیم کے بارہ میں راوی کہتا ہے کہ اس نے عمر بھر کبھی تھیر جانے میں ناغہ نہیں کیا۔ یورپیڈیز نے اُس زمانہ کے مذاق کے مطابق ۷۵ ڈرامے لکھے اور وہ پہلا شاعر ہے جو فلسفیانہ باتوں کو ایسٹج پر لایا۔ مشہور عالم مقرر ڈی ماسٹینز اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس ٹریجک شاعر کی موت بھی ٹریجک ہی ہوئی۔ یعنی شکار گاہ میں شکاری کُتوں نے اُسے تھکے ہوئی ڈکڑا لیا۔

جنگ سلی میں اس کے اشعار یونانی سپاہیوں کے آڑے آئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب نسی اس (Nesius) کی زیر قیادت یونانی فوج نے شکست کھائی تو فاستوں نے ان پر وحشیانہ اور ہیمانہ ستم ڈھائے۔ مگر اُن یونانیوں کا بال تک بھیک نہ ہوا جو یورپیڈیز کا ایک مصرع تک سنا سکتے تھے گویا اس کا کلام پروانہ رستگاری تھا۔ یونان کا یہ قابل احترام شاعر فوج کا جنرل اور معزز باشندہ اخیر عمر تک ایسٹج پر اگر پارٹ کرتا رہا۔

ان تین ہم عصر شعرا کے بارہ میں کونٹیلین (Quintilian) کی یہ رائے ہے کہ ”ایس کافی لِس پُرشکوہ و جارت پسند سو فوکلیر ثقہ و پُردقار اور یوری پیڈیز فصاحت کا بحر بیکراں تھا“۔
 سکندر اعظم سکندر اعظم کے عہد حکومت سے قبل ایتھنز میں ۳۴۰ سو ٹریجڈیاں تصنیف ہو چکی تھیں۔ سکندر کے زمانہ میں سکندریہ علم و ادب کا مرکز اور ڈراما کا مستقر بن گیا۔ اکثر محققین کا قول ہے کہ فن ڈراما سکندر اور اُس کے باپ کے حکومت کے زیر اثر یورپ اور ایشیا میں پھیلا، کیوں کہ جب وہ کسی ملک کو تسخیر کرتے تو وہیں ڈراما کر کے جشن منایا کرتے تھے۔ اور اس طرح وہاں کے باشندوں کو ڈراما کی چاٹ لگا آتے تھے۔ جب سکندریہ نے علم پروری کا پھریرا اُڑایا تو یونان کے تمام شاعر اسی جگہ اُمڈ کر آ گئے، اور فن ڈراما کو اوج کمال پر پہنچایا۔ ان شعرا میں سے سات کو جو سبع تیارہ کے نام سے مشہور ہیں ٹریجڈی لکھنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ انھوں نے ٹولمی (بطلموس) اور فلاڈلفس (Ptolemy and Philadelphus) کے عہد یعنی ۲۸۳ء تا ۲۷۱ء قبل مسیح کے مابین بے شمار ٹریجڈیاں لکھیں اور ان کا تماشہ کیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ عربوں میں سبع معلقہ کا خیال انھیں سبع تیارہ سے پیدا ہوا۔

از اکیس ۱۰۰ برس قبل مسیح حزقیل یودی نے یونانی زبان میں ایک ڈراما لکھا اور مذہبی ڈراما کا طح انداز
 A Ezekiel ہوا۔ اس ڈرامے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش اور قوم اسرائیل کی ہجرت
 کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ اس ڈرامے کی تصنیف سے حزقیل کا یہ مدعا تھا کہ یہو دکو ایک مثیل موسیٰؑ
 کی آمد کا نوید سنا کر ان کا حوصلہ بندھائے اور ان کے لوح دل پر یہ نقش کر دے کہ یہ غلامی کی ذلت کوئی
 دن کی بات ہی۔ جب حضرت موسیٰؑ پھر اس عالم فانی میں تشریف لائیں گے تو سب فراعنہ زماں خاک میں
 مل جائیں گے۔ اس ڈرامے کے اہم کردار حضرت موسیٰؑ، فرعون اور وہ ہستی ہیں جس نے طور پر جسد
 دکھایا۔ ڈرامے کے آغاز میں حضرت موسیٰؑ ساٹھ سطر کی ایک تقریر کرتے ہیں۔ اور ان کا عصا سانپ بن جاتا ہے۔
 گو اس ڈرامے کے صرف چند اوراق پریشان دستیاب ہوتے ہیں، لیکن یودی ابھی تک مثیل موسیٰؑ کی
 خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ اعتقاد ان کی اقتضاوی ترقی کے کس قدر حائل ہوا، محتاج بیان نہیں۔

(کومیڈی)

کومیڈی کی ابتدا ٹریجڈی اور کومیڈی اس لحاظ سے تو ام نہیں ہیں کہ دونوں کا مبداء باکس پوجا ہی لیکن
 باوجود اس قرابت کے ان کی آفرینش بالکل مختلف اور جداگانہ طریقوں سے ہوئی۔ ٹریجڈی اس باکس پوجا
 کی یادگار ہے جو کڑا کے کی سردیوں میں کی جاتی تھی۔ یونان میں یہ موسم بہت جانکش خیال کیا جاتا تھا۔ منو کی
 قوت سلب ہو جانے سے نہ صرف ہر بار باغوں اور مرغزاروں پر اؤس پڑ جاتی تھی بلکہ سب سے ترکاری بھی
 آگ کے مول ملتے تھے۔ اس حالت سے جو افسردگی و دوا سی کا ہجوم ہوتا تھا۔ وہ ٹریجک کورس کے ترانوں سے
 پھوٹ پھوٹ کر نکلتا تھا۔ اس کے برعکس کومیڈی اپنی تخلیق کے لئے اس باکس پوجا کی مرہون منت ہی
 جو نکلنے جاڑے میں کی جاتی تھی۔ جب درخت زعفرانی پوشاک اُتار کر دھانی جوڑا پہنتے ہیں اور زمین پر بھجھل
 کا فرش بچھ جاتا ہے۔ گویا یہ موسم ان تمام خوبیوں کا حامل ہوتا تھا جو بہار سے منسوب کی جاتی ہیں۔ یہی دن
 ہندوستان میں ہولی منانے کے ہیں۔ اور جو کچھ ہولی میں ہوتا ہے وہی عالم یونان کا تھا۔ ابتدا میں مذہب
 شہریوں کی تازگی طبع کا باعث ٹریجڈی اور جاہل دیہاتیوں کی تفریح کا سامان کومیڈی ہوا کرتی تھی۔ شہریں

ٹریجڈی کمال تقدس اور خلوص سے کی جاتی تھی۔ دیہات میں دہقان فی فصل پکنے پر باکس کی پوجا کر کے اظہار
تشکر کرتے تھے۔ اس تہوار کا نام اسکولیا (Ascolia) تھا۔ درجہ اس کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے۔
”اُس موقع پر ایک بکرا باکس کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ جس کے بعد لوگ گلی کو چوں میں شراب کے نشہ میں
چور دیوانہ وار پھرتے تھے۔“ جو گیت وہ گاتے تھے انھیں فلیک (Phallic) کہتے تھے۔ ان گیتوں میں
باکس کی حمد و ثنا کے علاوہ مختلف لوگوں کی شخصیت کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا۔ غرض کہ یہ ہجوم باکس کا بت
اُٹھائے گاتے بجاتے، ناچتے گودتے گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے لوگ حد اعتدال
سے گزر جاتے تھے، تو کورس کا فائدہ انھیں وہ کھری کھری سُناتا تھا کہ ان کا سب نشہ ہرن ہو جاتا تھا۔ اسی
اسکولیا سے کومیڈی نخلتی ہے کومیڈی یونانی لفظ کو مس سے (Comus) مشتق ہے جس کے معنی
(سیاحوں کا گیت) ہیں۔ دوسرا مصدر لفظ کومی (kome) بیان کیا جاتا ہے جس کے معنی گاؤں کے
ہیں مگر اؤل الذکر زیادہ مستند ہے۔

سوسیرین جب تہی پس ٹریجڈی کی بزم آرائی میں مشغول تھا میگیرا (megera) کے شاعر
SUSARION سوسیرین نے کومیڈی کا بازار گرم کیا۔ گو ٹریجڈی اور کومیڈی ایک ہی وقت پر منظر عام پر
آئیں لیکن کومیڈی کو فن کا رتبہ حاصل کرنے میں بہت مدت لگی۔ سوسیرین لوگوں کے عیب و بیہودیاں سیلج سے
ظاہر کر کے کومیڈی کا موجد بنا۔ کومیڈی کے ساتھ نقلیں بھی کی جاتی تھیں۔

کریٹینس یہ شاعر ۱۹۵ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اور ۲۳۳ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ یہ بہت سچلا ہجو گو تھا
CRATINUS اور لوگ اس کی سیاسی ہجوؤں کو بہت پسند کرتے تھے۔ سوسیرین پہلا شاعر ہے جس نے کومیڈی
کو ذاتی حملوں کے لئے خوفناک آلہ اور لوگوں کے عیوب کا سخت گیر محاسب بنایا۔ جب کومیڈی اور ہجو کے
پادشاہ ارسٹوفینز نے اس پر ”بد ہوش میخوار“ کی پہتی کمی تو اس نے اس طنز کو بہت محسوس کیا اور ایڑی چوٹی
کا زور لگا کر ایک کومیڈی تصنیف کی جس کا نام اس نے بوتل رکھا۔ جب ارسٹوفینز کی کومیڈی (بادل)
اور اس کی کومیڈی (بوتل) سیلج پر آئیں، تو ”بوتل“ نے ”بادل“ کے دھوئیں بکھیر دیے۔

یوپولس ارسٹوفینز کا دوسرا مد مقابل یوپولس تھا۔ جو ۴۴۵ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اور ۴۰۰ قبل مسیح میں

فوت ہوا۔ اس نے بہت سی ہجو یہ کومیڈیاں لکھیں جن میں سے ایک کی پاداش میں اسے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ شکوہ آمیز الفاظ اور پاکیزگی زبان کے لحاظ سے وہ واقعی ارسٹوفینز کا ہم پلہ ہے۔

کرمیٹس کرمیٹس ایک نفز گوشتااعر ہر دلعزیز مصنف اور قابل ایکٹر تھا۔ یہ کرمیٹس کا ہم نوالہ دہم پایہ تھا CRATIS اور اس نے کرمیٹس کی تمام کومیڈیوں میں پارٹ کیا تھا۔ یہی مصنف سب سے پہلے شہریوں کو سٹیج پر لایا۔ اپنی کومیڈیوں میں سیاسی معاملات کا ذکر کرنے سے وہ پہلو بچاتا تھا۔ ایسی کومیڈیاں جو سیاسیات میں دخل دیں قانوناً ممنوع کی گئی تھیں۔ لیکن یہ حکم ایک سال تک نافذ رہا۔ بعد میں منسوخ کیا گیا۔ جب کومیڈی ناقابل برداشت طور پر فحش ہو گئی تو علمائے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور ان میں سے تمام قابل اعتراض اور حیا سوز باتیں نکال کر ان کے بجائے تقریریں اور گیت ڈال دیے۔ اسی طرح کومیڈی کی زبان ہزلیات اور فواحش سے پاک ہو گئی۔

ارسطوفینز حقیقی کومیڈی ۴۲۵ قبل مسیح کے قریب ارسٹوفینز کے قلم سے رونما ہوئی۔ زمانہ حال ARISTOPHANES کے نقادوں کی نگاہ میں اس کی تصنیفات بھی غیر مذہب ہیں۔ گو یہ اعتراض بہت حد تک بجا ہی لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے اپنی کومیڈیاں ایتھینز اور سپارٹا کے طویل جنگ کے زمانہ میں تصنیف کی تھیں۔ ایتھینز کی جماعت عمومی کا سرگروہ (Cleon) کلی آن اس کا جانی دشمن تھا۔ اور حکومت ایتھینز میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اسی کے وجود سے متنب کی جاتی تھیں۔ یہ ڈراما نگار صلح کا حامی تھا اور کلی آن جنگ کا علمبردار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جن خیالات کا اظہار کسی پبلک جلسہ میں کرنا خطرناک متصور ہوتا انھیں ایکٹر سٹیج پر کھلے الفاظ میں بیدھڑک بیان کر جاتے تھے۔ جب کلی آن کے مخالفوں نے حمایت کا عہد کیا تو ارسٹوفینز نے ایک کومیڈی موسومہ نائٹ (Knights) تیار کی اور اس میں کلی آن کی وہ گت بنائی کہ تو بے بھلی۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ خود ارسٹوفینز نے اس کیرکٹر کا پارٹ کیا جس سے کلی آن مراد تھا۔ اس کی باقی کومیڈیاں بھی حکومت کی خرابیوں کے انکشاف کے لئے وقف ہیں۔ اس کی جولانی طبع دوست دشمن تو کجا خود اس کی ذات کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ کہہ گذرتا تھا۔ خواہ اس میں کسی کی دل آزاری ہو یا اپنی بدنامی بسقراط کی سی قابل احترام ہستی جس کی دوستی پر ارسٹوفینز ناز کیا کرتا تھا اس کی نکتہ چینی سے

نبیج سکی۔ جب شاہ ڈائی آنی سس (Dionysius) نے ایتھینز کی زبان اور تمدن سے آگاہ ہونے کی خواہش ظاہر کی تو افلاطون نے اسے ارسٹوفینز کے ڈرامے بھیج کر کہا کہ ان میں اہل ایتھینز کی صحیح تصویر نظر آئے گی۔

یوبولس انہی فینز اور ایلکلیز ارسٹوفینز کے بعد یوبولس۔ انہی فینز اور ایلکلیز نے بے شمار کومیڈیاں لکھیں۔ صرف آخر الذکر نے جو ۳۹۴ میں پیدا ہوا اور ۳۸۸ قبل مسیح میں فوت ہوا، ۲۰ کومیڈیاں لکھیں۔ اس کی تصنیفات فصاحت و بلاغت کی کان ہیں۔ یہ شاعر ۱۰۶ سال کی عمر میں فوت ہوا اور اخیر دم تک فرما لکھنے میں مصروف رہا۔

میننڈر ایلکلیز کا برادر زادہ میننڈر ایک بلند پایہ ایکٹر اور کومیڈی نویس تھا اس زمانہ کی کومیڈی MENANDER میں تمدنی اور معاشرتی باتوں کا ذکر ہوتا تھا۔ جو کا عنصر کو مفقود نہیں ہوا تھا مگر بہت کم ہو گیا تھا۔ اور اس کی جگہ حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں نے لے لی تھی۔ میننڈر نے (۳۴۲-۲۹۱ قبل مسیح) اعلیٰ طبیبوں کے لئے متعدد کومیڈیاں لکھ کر اس کا پایہ بلند کر دیا یہ شاعر لذات نفسانی کے مویہ Epicurus ایپی کیورس کا دوست اور اس کا ہم نوا تھا۔ اسی لئے ایپی کیورس کے مذاق اور عقیدہ کی جھلک اس کی تصنیفات میں پائی جاتی ہے۔ میننڈر کے ڈرامے سراپا تہذیب ہونے کے علاوہ بہت دلچسپ اور فصیح ہیں۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ نیکی کا ثمر اور بدی کا مال سبق آموز طریق پر دکھائے۔ وہ فطرت انسانی کا چابکدست مصوّر تھا۔ کونٹنٹن اس کے اس کے ڈراموں کو فصاحت کے مدرسہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ فطرت نگاری میں اس کو وہ ملکہ حاصل تھا کہ نقاد کو اس کے ڈراموں کے مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا میننڈر کے ڈرامے فطرت کا عکس ہیں یا خود فطرت ان ڈراموں کی وضع پر ڈھالی گئی ہے۔

فیلسی ماں فیلی مان میننڈر کا ہم عصر تھا اور مد مقابل۔ لیکن اس نے متقدمین کی طرح عوام کے لئے Phileman کومیڈیاں لکھیں۔

یونانی کومیڈی کے تین اقسام یونانی کومیڈی کے تین اقسام۔ قدیم۔ وسطیٰ اور جدید ہیں۔ کومیڈی قدیم اُس زمانے کی کومیڈی کہتے ہیں جب کرکیٹر حقیقی شخص ہوتے تھے اور اصغر ناموں سے سٹیج پر لائے

جاتے تھے۔ اس میں بہت دل آزاری سے کام لیا جاتا تھا۔ اور دل کھول کر مذمت کی جاتی تھی۔ اس قسم کے ڈرامے آخر کار ناقابل برداشت ہو گئے۔ یوبولس کریٹس اور ارسٹوفینز اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شعرا کسی بد معاش چور اُچکے، زنا کار، قاتل، کسی بد اطوار کی خبر لینے میں تسمہ نہیں لگا رکھتے تھے۔ کومیڈی وسطیٰ میں حقیقی کومیڈی کی طرح اخلاق و عادات کے نقشے دکھائے جاتے تھے۔ لیکن ذات کا ذکر یا زندہ کیرکٹروں کا نام لے کر صلواتیں سنانا خارج کر دیا گیا تھا۔ اور فرعی ناموں سے کام لیا جاتا تھا۔ کومیڈی جدید فن کی انتہائی منزل ہے۔ جو موجودہ کامک ڈراما سے لگا کھاتی تھی۔ جس میں کیرکٹر محض ضحیٰ ہوتے ہیں۔ صرف یہ ضروری ہوتا ہے کہ کیرکٹر حقیقت کے اور ڈرامہ قواعد فن کے مطابق ہو۔ اس کومیڈی کا رواج سکندر اعظم اور سینڈر کی وفات کے مابین ہوا۔ اس وقت یونانی سیٹج اچھا خاصہ مکتب اخلاق بن گیا۔ اور شعرا نے اس میں جو فکر، نزاکت اور شان پیدا کی اس سے اس فن کو چار چاند لگ گئے۔ ٹریجڈی اور کومیڈی کے مناصب اس طرح یونان ادبیات کی اعلیٰ ترین صنف سے مالا مال ہو گیا۔ عہد قدیم کے یونانی ہمیشہ ٹریجڈی اور کومیڈی کو دو جدا گانہ اصناف تصور کرتے رہے۔ ہاں رقص و سرود شعر خوانی اور تقریریں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی تھیں۔ اور یہ اعلیٰ درجہ کے شاعروں کے تخیل کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ مگر یہ جائز نہ تھا کہ کوئی ٹریجڈی نویس کومیڈی لکھے۔ تعلیم یافتہ اشخاص ایکٹ کرتے تھے۔ ایکٹر اور ایکٹری کا پیشہ ذلیل خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ مشہور مقرر ڈی ماسٹینز کے بارے میں روایت ہے کہ ڈراما اس کی تعلیم کا جزو اعظم تھا۔ ایکٹری ٹائرس (Satyrus) اس کا دوست اور معلم تھا اور اسے بتایا کرتا تھا کہ کس طرح حرکات و سکنات کی مدد سے وہ اپنی تقریروں کو موثر بنا سکتا، مشہور ایکٹریوٹولیلس (Neotolylus) اور ارسٹوڈیمس (Aristodymus) ممالک غیر میں سفارتوں پر مامور ہوتے تھے۔ جہاں ان کی بہت آد بھگت ہوتی تھی۔

یونانی تھیٹر یونانی تھیٹر ایک نیم دائرے کے شکل کی بے سقف عمارت ہوتی تھی جس کے پچھلے حصہ میں سیٹج ہوتا تھا اس میں گول ڈنگل (Amphetheatre) کی طرح نشستوں کی قطاریں تدریجاً بلند ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اس کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ تین ہزار تماشاخی اس میں آسانی سے سما سکتے تھے۔ ایکٹر مصنوعی پہرے

لگاتے تھے۔ اور قد کو بلند کرنے کے لئے بگن پنتے تھے (Buskin) جو ایک قسم کی اونچی ایڑی کے بوٹ ہوتے تھے ان مصنوعی چروں کا منہ ترم نہا ہوتا تھا۔ تاکہ آواز دور تک پہنچ جائے اسی سے کلمہ ڈرامٹک پرستی وضع ہوا ہے یہ لاطینی لفظوں پر (Per) بمعنی ذریعہ اور سینو (Seno) بمعنی آواز نکالنا سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ڈرامے کے مصنوعی چہرہ کے ہیں۔ اسی طرح انگریزی لفظ (Person) (شخص) ہے جس کے لغوی معنی بولنے کا "ترم" ہیں۔ تماشے روز روشن میں ہوتے تھے اور دن بھر رہتے تھے۔ تین ڈرامے اور ایک نقل ایک دفعہ دکھائے جاتے تھے۔

تھیٹر کے اخراجات چوں کہ ڈرامے مذہبی اور قومی لوازمات میں شمار ہوتے تھے اس لئے اس کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا ہوتے تھے۔ مقصد بیان مذہب فرماں روا یاں ملک تعلیم یافتہ اور ان پڑھ اغرض کہ ہر شخص اکیڑوں کی قدر افزائی میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور ان پر خطابات انعامات مناصب جلیلہ اور جاگیرات کی بارشیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور شعرا پارٹ لینے کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔

استحاذ ثلاثہ یونانیوں نے استحاذ ثلاثہ کے نام سے ڈراموں کے لئے جو اصول وضع کیا وہ زیادہ تر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے یورپ کے ڈرامے نگاروں میں ایک لامنتی بحث کا دروازہ کھل گیا ہے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور جس کا تذکرہ آئندہ بابجا آئے گا۔ یہ اصول تین حسب ذیل شقوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ اتحاد زمان اس کا منشا یہ ہے کہ جو کچھ ڈراما میں دکھایا جائے وہ ایسے واقعات تک محدود ہو جو ۲۴ گھنٹے میں واقع ہوئے ہوں۔

۲۔ اتحاد مکان یہ چاہتا ہے کہ تمام واقعات ایک ہی مقام سے تعلق رکھتے ہوں۔

۳۔ اتحاد عمل اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی ایک ڈرامے میں صرف ایک ہی ایکشن واقعہ یا پلاٹ ہونا چاہیے۔ آخر الذکر دنیا بھر کا مسئلہ کلیہ ہے۔ مگر بحث پہلے دو شقوں کے متعلق ہے۔

قیصر کا راکلا یونان میں ڈراما پر طرح طرح کی گل کاریاں ہو رہی تھیں کہ ۱۵ء میں جہاں سوز کا راکلا

قیصر روم آندھی اور طوفان کی طرح آیا اور ایک دن میں سکندریہ میں قتل عام کر کے اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اور تمام یونانی تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔ تمام تھیٹر حکماً بند کر دیئے گئے۔ اور ڈرامے کا ایکٹ تعزیری جرم قرار دیا گیا۔ فن ڈراما یونان میں معدوم ہو گیا۔ اور اس کی رہی سہی رونق جاتی رہی

اصلاح رسم خط

(۲)

(بہ سلسلہ رسالہ اردو حصہ پنجم جلد دوم)

(از جناب میر احمد علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع نائٹریڈ رآباد دکن)

نقشہ تعریب نمبر (۲) میں واؤ ماقبل مفتوح کا آخری سراہائے مخفی کی شکل میں مسودہ میں بنایا گیا تھا مگر طباعت میں اس کی شکل بہت بھدی بنا دی گئی اور نیچے کو ایک چونچ نکالی گئی ہے۔

اسی طرح نقشہ تعریب نمبر (۳) میں یائی اعراب کی علامتیں جو (۷) اور (۸) کے اٹے میدے ہندسوں میں دکھائی گئی ہیں۔ طباعت میں بالکل بگاڑ دی گئی ہیں (۷) اور (۸) کے ہندسہ ضرورت سے زیادہ مقدار میں دکھائے گئے ہیں نیز (۷) اور اٹے آٹھ (۷) کے ہندسوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے (۷) سات اور اٹے (۷) آٹھ کے ہندسے باریک رہنے چاہئیں۔ (۷) کا ہندسہ یاے مجہول کی مختصر شکل ہے۔ اور اٹے آٹھ کا ہندسہ یاے لئے جسٹم کائنات یاے حرفت کے دائرہ کی مختصر شکل ہے۔ اب ترمیم مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاے ماقبل مفتوح کی علامت کے اظہار کے لئے بجائے آٹھ کے ہندسہ کے (۷) ہمزہ کی شکل خط منحنی قائم کی جائے کہ یہ یاے ماقبل مفتوح (۷) کی مختصر شکل ہے۔

یاے مخلوط

نقشہ تعریب نمبر (۴) میں یاے مخلوط کے تلفظ کے اظہار کے لئے جو تشکیلی قائم کی گئی ہے وہ غالی از وقت نہیں معلوم ہوتی لہذا دو آسان مول درج ذیل کے جاتے ہیں۔

(۱) اول۔ یائی اعراب کے آیاؤ کے اتصال سے یاے مخلوط کا تلفظ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ بیسے

(جھوڑا)۔ چوٹی (۲) دھو۔ سہو۔ لہو (۳) کیا۔ کیوں

(۲) دوم۔ جس طرح واؤ مجہول سے الف کے ساتھ واؤ مخلوط کا تلفظ قائم کیا گیا ہے۔ اسی طرح یاے مجہول سے

الف یا واؤ کے ساتھ یاے مخلوط کا تلفظ قائم کر لیا گیا ہے۔ جیسے۔ کیا۔ کہوں۔ پیو۔ پیو۔
 نوٹ۔ واؤ معروف و مجہول کے اعراب میں ماقبل کا تلفظ بھی معروف و مجہول ہی ہو جاتا ہے جیسے (پیو۔ پیو) میں مگر کہوں میں ماقبل کا تلفظ غیر معروف تختفی لہٰذا کا واؤ ملفوظ ہی معروف نہیں۔
 لیجئے والا

ف۔ پہلا قاعدہ بہ نسبت دوسرے قاعدہ کے زیادہ آسان۔ جامع۔ وسیع الاثر مختصر اور اصولی ہے۔

(۵)

حروف دال اور واؤ کی اشکال میں جو صورتی التباس ہے اُس کے رفع و اد کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حرف دال کی کتابت و طباعت بجائے نستعلیق کے خط نسخ میں ہو کرے یعنی اُس کا نیچلا اور دوسرا سر ابھی پہلے اور اوپر کے سرے کی طرح پھیلا رہے۔

مرکب لفظ کا جوڑ توڑ

رسم خط اردو کی اصلاحی تجاویز مندرجہ رسالہ اردو جلد اول حصہ اول و دوم ۱۳۲۷ء میں مرکب لفظ کے درمیان وصل و فصل کی عدم یکساں کو رسم خط اردو کا نقص عظیم قرار دیتے ہوئے اُس کے رفع و اد میں جناب مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب نے چار قاعدے حسب ذیل تجویز فرمائے ہیں جن میں قاعدہ نمبر ایک و چار جو مختلف التعریف ہیں اور نتیجہ ایک واقع ہوئے ہیں اس لئے کہ مرکب الفاظ کے اجزائے ترکیبی کا مستقل الفاظ ہونا یا مرکب الفاظ کا مستقل الفاظ سے ترکیب پانا ایک ہی بات ہے اس پر مولوی ہاشمی صاحب کو من حیث المجموع اتفاق ہے محض قاعدہ نمبر ایک و چار کے صرف اُن مثالی الفاظ کے رسم خط وصل و فصل میں اختلاف ہے جو تخفیف یا ترخیم کی صورت میں واقع ہوئے ہیں۔

قاعدہ ۱۔ ہر ایک مستقل لفظ جزو ترکیبی کا رسم خط مقطوع (الگ) ہو۔

قاعدہ ۲۔ لاحقہ یا سابقہ کا رسم خط جو مستقل معنی نہ رکھتا ہو متعلق علیہ (لفظ مستقل) کے ساتھ موصول ہو

قاعدہ ۳۔ حروف ربط کا رسم خط مقطوع ہو۔

یعنی ہر ایک مستقل لفظ جزو ترکیبی اور حرف ربط کا رسم خط مقطوع اور جزو ترکیبی غیر مستقل لفظ کا موصول ہو۔

جناب ہاشمی صاحب تمام مستقل الفاظ خواہ مفرد استعمال کئے گئے ہوں، خواہ مرکب الفاظ کا جزو بن گئے ہوں۔ علیحدہ علیحدہ

بغیر ملائے لکھے اور چھاپے جائیں گے۔

اختلافی جزو رسم خط (الفاظ تخفیف یا ترخیم شدہ)

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب - کن پھٹا - پن گھٹ { دونوں رسم خط میں ہر ایک جزو ترکیبی غیر سالم کا سابقہ
مولوی ہاشمی صاحب - کنپھٹا - پنکھٹ { مستقل یعنی ترکیبی صورت میں واضح ہو رہا ہے۔

قواعد مجوزہ کی تنقید کے پیشتر بنا رجحان (عدم یکسانی) کی واقفیت و نوعیت اور مواقعات و موجبات پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ عدم یکسانی زیر اصلاح کا رسم خط مختصر نویسی کے ساتھ کیا تعلق ہے اور کس درجہ اس کی اصلاح ضروری اور ممکن ہے۔ چونکہ عدم یکسانی زیر اصلاح کا تعلق مرکب لفظ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے اولاً مرکب اور لفظ مرکب کے باہمی فرق کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرکب اور لفظ مرکب کا جو فرق ترکیب سے جب نوعیت کا اظہار مقصود ہو تو مرکب ہی اور اگر محض لفظیت کا اظہار بالمقابل پیش نظر ہو تو لفظ مرکب ہے یعنی کیا مرکب ہی (نوعیت) اور کیا لفظ ہی (مفرد یا مرکب) یہ فرق قرینہ سوال مندرجہ صدد سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً - سیل آب - ایک مرکب اضافی ہے اور سیلاب ایک لفظ مرکب ہے۔ یہاں یہ قرینہ سوال پیدا نہ ہوگا کہ سیل آب کیا لفظ ہے یا سیلاب کیا مرکب ہے۔ بلکہ بالعکس - نیز یہ کیا لفظ ہے کا سوالی مقصود یہ ہوگا کہ یہ لفظ مفرد ہے یا مرکب - جیسے کھٹ رس ایک مرکب تعدادی ہے اور کھڑاگ ایک مرکب لفظ ہے۔ چھوٹی انگلی ایک مرکب توصیفی اور چھنگلی ایک مرکب لفظ ہے مگر بحالت تخفیف مرکب اور مرکب لفظی دونوں جمع ہو سکتے ہیں مرکب ابی اور الفاظ تمیز فعل خبر مرکبات (ہی حرف حصر) اور مرکبات نقل الصوت کا شمار مرکب الفاظ میں نہیں صیغہ گس پٹہ - جوں توں - چوں چوں

قواعد مجوزہ مذکورہ بالا کے ذریعہ جو صحیح سالم میدان منتخ سے ابھی واپس نہیں ہوئے ہیں - جوں توں کو کے صرف اُن الفاظ کی عدم یکسانی وصل فصل کا رفعہ ہوا ہے کہ جن کا محض ایک جزو ترکیبی (لاحقہ و سابقہ) انفراداً غیر مستقل واقع ہوا ہے۔ حالانکہ عدم یکسانی زیر اصلاح کا دخل و تعلق نسبتاً اُن مرکب الفاظ سے زیادہ ہے کہ جن کا جزو یا اجزائے ترکیبی انفراداً تو مستقل اور ترکیباً غیر مستقل واقع ہوئے ہیں - جن کا رسم خط بلا لحاظ خصوصیات مختصر نویسی قواعد مذکورہ کی بنا پر محض رسم خط انگریزی کی اتباع میں ہمیشہ کے لئے مقطوع قرار دیا گیا ہے جس سے مفردات علی مرکبات کی صورت میں مستقل ہو جاتے ہیں - باوجودیکہ مفردات

(اجزاء ترکیبی موصولہ) جو درحقیقت زبان کے اجزاء بسیط میں اور زبان کے اصلی سرمایہ کا وقار و اعتبار قائم رکھتے ہیں۔ اُن کا انحطاط زبان کا انحطاط ہی اور یہ انحطاط ”کاتا سوت کپاس“ کے مصداق ہے۔ قواعد مذکور کا رسم خط انگریزی کی اتباع اور اُسی کی مناسبت سے مرتب ہوئے ہیں جس کی تمہیدی مثالوں میں (دیکھتے دیکھتے اور دوپہر) کا رسم خط موصول یعنی بلافصل تصور کر لیا گیا ہے رسم خط انگریزی منفصل حروف میں واقع ہوا ہے۔ بخلاف اس کے اردو کا رسم خط متصل و محسنہ صورت میں ہی اس لئے قواعد مذکورہ اردو فارسی وغیرہ کے رسم خط پر چسپاں نہیں ہو سکتے۔ اردو کے رسم خط کا تعلق مختصر و بسیط سے ہے جو بہ اعتبار وصل و فصل ایک ہی تلفظ کی مختلف صورتوں پر منطبق ہوا کرتا ہے جس سے کبھی تو تلفظ کا اظہار اور کبھی معنی کا اختیار مقصود ہوتا ہے اور کبھی تو اُس سے اختصار اور حسن خط مطلوب ہوتا ہے جس پر جزلفظ ایک جز ترکیبی اور جز ترکیبی ایک جزلفظ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے مختصر نویسی کا رسم خط ترکیبی بہ اعتبار وصل و فصل عدم یکسانی کا مقتضی ہی یعنی مختصر نویسی یا عدم یکسانی ایک ہی چیز ہے۔

رسم خط

”تحلیل و ترکیب“

(۱) نمبہ
(رعایت تلفظ)

گلستاں	}	وہ ہی	یہ ہی	(ٹال مٹول - ٹالم ٹول)
گلستاں		وہی	یہی	ٹالمٹول

وَقْتُ اِسْ جِسْرِ فَايَسْ كَشْتِي عَمْرُو اِسْ ۛ جِسْ جَبْہِہِ پَر جَا لَگِي وَہِہِ كَنَاہِہِ ہُو گِيَا
یہ ہی سورج زمیں تھے ماں باوا ۛ مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا

(۲)

(رعایت تلفظ و معنی)

(چھ دھام) (چھ دھام) (چھ ٹانگ - چھٹانگ) - (سی آم - سیام)

(بال امرت - بالامرت)
دوا (بچہ نہ مرنے کی) دوا (بچے نہ مرنے کی)

(۳)

رفایت معنی یا سباق عبارت کا عاملانہ اثر
یعنی یکساں تلفظ میں رسم خط تابع ہوگا معنی کے
(خوش آمد - خوشامد) (عظیم آباد - عظیم آباد) (کل آئی - کلانی)
(بے معنی)

(کھے لو - کھیلو) - (بے روزہ - بروڑہ) - (سی لا - سیلا) (تقف بے ستون - کوہ بیتوں)
(یہ امیر کہلاتا ہے - امیر یہ کہلاتا ہے) (وہ ہٹ کر مٹھا - وہ ہٹ کر مٹھا) (چھین لا - چھینلا) (مبارک باد - مبارک باد)
(غرض ہی) یہ کتنے کتنے ہیں - سختی پر کٹ کھنے بڑے ہیں (لن ترانی ایک آیت قرآنی ہی - آپ کی لسانی ختم بھی ہو گئی)
(دختر درزن کا سینا دیکھ کر - جی یہ چاہتا ہو کہ مل دیکھے) - تن درست ہی اس کا جو تندرست ہو -
(کلانی ہاتھ میں لیکر مرے دل کو کل آئی ہو) (دل مل)

مالا پھرت بگ گیا گیا نہ من کا پھیر کر کا من کا چوڑ کے من کا منکا پھیر
جو کوئی کسی کو یار کلپ سیکگا یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پانیکا
پادشاہے بہ کا شمیری گفت کاش میری کہ من خلاص شوم

(۴)

(ادبی و خطابی حالت)

خطابی
انشاء اللہ غاں آج آئیگا
چلواری
دھواںسا

ادبی
انشاء اللہ وہ آج آئیگا
چلواری
دھواںسا

خطابی
کم رکھ
دستار
شکر کھانا حرام نہیں
ناچنا دیکھنا عین معصیت ہے

ادبی
کم رکھ
دس تار
شکر کھانا حرام ہے
ناچنا دیکھنا عین سعادت ہے

ادبی
راج پوت نہیں
راجہ بڑا راج حیت ہے
صف در وصف شکن ہے

خطابی
ہر ایک راج پوت
رجبت بڑا راجہ ہے
صف در

(۵)

رسم خط
کہ + ا

(رعایت وزن شعری)

کہ اخلاق - کا اخلاق = از صحبت دوستاں برنجم - کا اخلاق بدم حسن نمایند = کہ احتمال - کا احتمال (کھتال) =
ترک احسان خواجہ اولتر - کا احتمال جفاے بواباں -

(۶)

رسم خط مرکبات
ہی

(یوں ہی - یونہی) - (جوں ہی - جونہی)

رسم خط

ہا و جات

(جام ہا - جامہا) (حامہ ہا - حامہا) (تختہ جات - تختجات)

الف ثکل یا

(اولے تر - اولتر) (ثنی جات - ثنجات) (مولانا - مولینا) (علاحدہ - علیحدہ - علیحدہ)

مکرر - مشدود - مخفف

(شب بو - شبو) (ان نیالی - انیالی) (شب برات - شبراتی و شیراتن)

(ہمزہ موصول و مقطوع)

(مفردات)

(مسئلہ - مسالہ) (ہیئت - ہیئات)

اختصار اور حسن خط

- (۱) - (اس کے لئے - اکیلے) (باگ ڈور - باگڈور) (کم بخت - کبخت) (کم زور - کمزور)
- (۲) - بیکسی - بے بسی - پیشرو - پیش خیمہ - جانفروش - جاں نثار - کم گو - کم سخن - (پیشہ) (پیشہ)

مفردات کا رسم خط مرکبات کی شکل میں

ف - مفردات کا جوڑ کبھی جدا نہیں ہوتا ہے تا وقتیکہ شروع یا درمیان میں حرف سالم (ا - ژ - ر - ز - و - ڈ - ذ - و) اردو

نہ داخل ہو جائے مگر محض اظہار تلفظ کی خاطر جیسے سٹ پٹانا۔ بی بی۔ چٹ پٹا۔ جھٹ پٹا۔ پنجن چنگا۔ تیشل رسم خط مندرجہ بالا سے جس عدم یکسانی کا اظہار ہو رہا ہے اس کو نقص عظیم تصور کرتے ہوئے اس کا ازالہ مجوزہ قاعدوں کی رو سے کس درجہ ہو رہا ہے۔ غور طلب ہے۔

قاعدہ ۱۴ کا موضوع بالاتفاق اجزائے ترکیبی کا انفراداً مستقل لفظ ہونا قرار پایا ہے۔ حالانکہ ایک مرکب لفظ کے معنی یہ بہیت اجتماعی و ترکیبی دیکھے جاتے ہیں نہ کہ بہیت جزئی و انفرادی اس لئے مرکب الفاظ کے اجزاء ترکیبی کے مستقل یا غیر مستقل ہونے کا جو اصول تجویز پایا ہے وہ رسم خط زیر بحث کا معیار نہیں ہو سکتا ہے۔

(۱) مستقل لفظ کے قرار داد میں ترکیبی حالت نظر انداز کر دی گئی ہے جو دراصل اجزاء ترکیبی کے مستقل ہونے یا نہ ہونے کا معیار ہے جس میں مستقل الفاظ اپنے اصلی معنوں میں واقع نہ ہونے پر ترکیباً غیر مستقل ہو جاتے ہیں جیسے (قلرو موادید۔ مخرود۔ خمیازہ۔ خوشدامن۔ ششدر۔ صفدر۔ لسترانی۔ شاخانہ۔ آجکل۔ اندنوں) جمعرات کشمکش گوشوارہ (خلاصہ) حلاخور (بھنگی) میدوست۔ زفرزم۔ امرتسر۔ نامزد۔ قلمبند۔ گفتگو

(۲) اسی طرح وہ الفاظ بہیت اجتماعی، ترکیبی معنوں میں مربوط ہو کر مستقل بن جاتے ہیں۔ جو انفراداً مستقل نہیں جیسے۔ بمجولی = ہم (جوڑی۔ جولی۔ زولی) ہموار۔ دشوار

(۳) اجزائے ترکیبی کے سالم یا غیر سالم ہونے۔ تخفیف و ترخیم وغیرہ کے معنوی یا لفظی ہونے اور ان تخفیف شدہ الفاظ کی اصلیت کا امتیاز اسی ترکیبی حالت کی خصوصیت پر موقوف ہے۔ سالم غیر سالم (کن کوت۔ کنوٹپ) کھٹ رس کٹھن۔ تخفیف و ترخیم لفظی یا معنوی (تختی کے کٹ کھنے۔ کنگھنے کٹے و کنگھتلیہ۔ گل مالا)

اصلیت۔ پنکٹی۔ پریان (پنگٹ) پانی (پنیری) پانچ (چھوٹ پن (چھوٹا) پن چھٹ (پانی چھوٹا) (۴) اگر اجزاء ترکیبی کے مستقل یا غیر مستقل ہونے کا معیار جزوی یا انفرادی معنی رہیں گے تو خواہ مخواہ مرکب الفاظ (مفرد) کی مربوط و غیر مربوط تحلیل ہونے لگے گی۔ جیسے دستار (دس تار) کمرکھ (کم رکھ) چھدام (چھ دم) منکا۔ (من کا) متوالا (مت والا) متلانا (مت لانا) ڈبڈبانا (ڈب ڈبانا) مللا (مل ملا) پھٹپھٹا (پھٹ پھٹا) کھپانا (کل پانا) گھگیوار (گھی گوار)

مندرجہ بالا مثالوں میں ایک ہی قسم کے الفاظ کی تحلیل و ترکیب کے حسب ذیل قاعدے مقرر ہو سکتے ہیں۔

ف ۱۔ مرکب لفظ کے ہر ایک جزو یا اجزائے ترکیبی اپنی اصلی معنوں میں واقع ہوں تو رسم خط حسب موقع موصول یا مقطوع ہوگا۔ اور یہی ترکیب ترکیب معنوی مقصور ہوگی جیسے (باگ ڈور - باگڈور)

(۲) مرکب لفظ کے جزو یا اجزاء ترکیبی - اپنے اصلی معنوں میں واقع ہوں تو رسم خط موصول ہوگا۔ اسی ترکیب ترکیب لفظی مقصور ہوگی۔ جیسے حلاخیز - قلمرو - کھڑک - زمزم - ہید دست - خوشدامن وغیرہ۔

(۳) اگر ترکیب میں اجزاء ترکیبی کے اصلی معنوں کا اظہار تشبیہ یا نسبت ہو تو اسی ترکیب بھی ترکیب معنوی مقصور ہوگی۔ مگر اس کا رسم خط ہمیشہ مقطوع ہوگا جیسے ناگ تھنی (ناگ کے پھن کا سادخت) اونٹ کٹارا (کائٹے کا دخت جو اونٹ کا من بھاتا ہے)

(۴) ایسے مرکب الفاظ کا رسم خط کہ جن کے اجزاء ترکیبی متحد الاصل ہوں یا مختلف الاصل مگر متحد المعانی ہوں تو موصول ہوگا جیسے - پلصراط - ناپناؤ - جلیان - مجلسرا - سنبھری۔

(۵) وہ ترکیبی الفاظ کہ جن کا مفہوم محض ترکیبی صورت میں واضح ہوتا ہو یا وہ مرکب الفاظ کہ جن کے مفہوم اور ہیئت اجتماعی - بطور مفرد کے پائے جاتے ہوں ان کا شمار مفرد حکمی میں ہوگا اور ان کا رسم خط موصول جیسے فیلسوف شیشدرہ - آنجورہ - برشکال - دیکمہ - زہریر - ہرد لغزیز - چشمید۔

(۶) الفاظ ذیل کے فارسی مرکبات کا رسم خط عموماً مفرد حکمی و ترکیبی لفظی کی طرح موصول ہوگا۔

{گل (ف - ہ) پیش - خوش - دل - آب - دست - سبک - یک}

(۷) اسماء (محله - قصبہ - شہر) کے مرکبات میں مستقل الفاظ کا رسم خط مقطوع ہوگا مگر اس آخری لفظ کا

رسم خط موصول ہوگا جو مرکبات سے مخصوص ہے۔ جیسے رامپور - مونگیر - سونماتھ - ندرگ - کلیکٹ - گلبرگ۔

(۸) الفاظ نقل الصوت کا رسم خط مقطوع ہو۔ جیسے قل قل - چوں چوں - سن سن وغیرہ۔ جب اس قسم کے الفاظ اسم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو ان کا رسم خط موصول ہوتا ہے جیسے قلمقل اور ققلقل۔

تخفیف یا ترخیم

مولوی ہاشمی صاحب (کنپٹھا - پنکٹ)

مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب (کن پٹھا - پنکٹ)

اب قاعدہ نمبر (۴) کے اُس اختلافی جز سے بحث کی جائیگی کہ جس کا تعلق مرکب الفاظ کے اجزاء ترکیبی کی تخفیف یا ترخیم سے ہے۔ بلحاظ معنی انفرادی۔ قرینہ استدلال میں دونوں صاحبوں کا اتفاق ہے مگر طریقہ استعمال میں اختلاف۔ مولوی ہاشمی صاحب کا محض طریقہ استعمال درست اور قابل اتفاق معلوم ہوتا ہے، اس لحاظ سے کہ ایک درخت کا دوسرے درخت میں پیوند بغیر قلم کے نہیں لگتا، اسی طرح پتھر اور لکڑی کا جوڑ بھی اس وقت تک ٹھیک نہیں بیٹھتا جب تک کہ جوڑ کے اجزاء میں کانٹ چھانٹ نہ ہوئے ایسے اکثر الفاظ کا جوڑ کٹ چھٹ کر اور آپس کے اختلاط اور ارتباط کی رعایت سے مشاثر ہو کر کچھ ایسا پیوستہ اور ایک قالب ہو جاتا ہے کہ اُس کے اجزاء کی اہلیت کا اظہار بہت مشکل ہو جاتا ہے جیسے گننا، گننا۔ گستاخگر۔ چھنیگا۔ چھنیگی۔ پھیل۔ وغیرہ۔

سنگت سے پھل ہوتا ہے وہی تل وہی تیل جات پات سب چھوڑ کر بیابان پھیل

مگر یہ اصول ہمیشہ کے لئے بطور کلیہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہی تخفیف جب لفظ کی معنوی خصوصیت میں واقع ہوگی تو وہ تخفیف ملوثی مقصور ہوگی۔ پس تخفیف لفظی و تخفیف معنوی دونوں صورتوں کا رسم خط کسی طرح ایک ہو نہیں سکتا جس طرح ترکیب معنوی کا رسم خط مقطوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح تخفیف معنوی کا رسم خط بھی مقطوع ہونا چاہئے اور تخفیف لفظی کا تخفیف لفظی = کپٹھا۔ پگٹھا۔ پچور جموات۔ بچپن (اعراب اور ہائے محضی کی تخفیف) مگر جب تلفظ یا معنی میں التباس کا اندیشہ ہو یا کتابت میں دشواری تو رسم خط مقطوع ہونا چاہئے جیسے ست بھیت۔ ست بجا (ستجا)۔

تخفیف معنوی جزاؤں - گل مالا - (تخفیف) (بھتیج (ہو - دادا) (گلا) (تخفیف)

کال کوٹھری - کل (جبا - جبی - منہا - منہی - سراسری) اکل (کھرا - کھری) چھٹ پونجیا - ادھ (موا)۔ موتی (گل پٹرا)۔

تخفیف معنوی جز دوم - مونہ پٹ - بگٹٹ - لکٹٹ - کل پٹا (اُپارنے والا)

فارسی مرکبات تخفیف شدہ

(فارسی اسنادات کی تخفیف و ترخیم تبدیل - تقلیب)

تخفیف واو عطف - متمیز - قیدت - گلفند (درست و نیز - قے و دوست - گل و قند)

تخفیف علامت اضافت - ابدت - کلچن - کلحکت - نیشکر (آب دست - گل چمن - گل حکمت - نیشکر)
 قلب بہ فک اضافت - دستخط - تبحال - شیون - خونہا - تدرستی - خاکناے (خط دست - خالتب - خون شب
 ہائے نون - در معنی تن - نائے خاک)

حرف کی تخفیف = آبدیدہ (آب بدیدہ)

اعراب کی تبدیل = شبو - جمع و نوح (اول کا و او معروف مجہول کے ساتھ - دوم کا و او مجہول معروف کے ساتھ)
 قاعدہ ۲ ایسے لاحقہ و سابقہ کا رسم خط موصول قرار دیا گیا ہے جو معنا و افراد غیر مستقل ہے اور مثال میں صرف
 اس لاحقہ کا انحصار ہوا ہے جو بصورت علامت فعل (گا) افراد غیر مستقل واقع ہوا ہے، اور نوعیت لفظی اس کی علامت سے
 مخصوص ہوجاتی ہے مگر قاعدہ مذکور میں نوعیت لفظی کا تعین ہوا ہے نہ کثرت امثال کے ذریعہ مختلف صورتوں کی صراحت کی گئی
 اور سابقہ کی تو کوئی مثال ہی نہیں جس سے یہ قاعدہ بعنوان لاحقہ محض علامات فعل کے لئے منحصر ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایک
 مستقل لفظ جبکہ حالت ترکیبی میں اصلی معنی نہیں دیتا ہے تو بصورت لاحقہ سابقہ اس کا رسم خط بھی موصول ہونا چاہئے جیسے
 رفعداد - مبارکباد - یہ قاعدہ ترنیا ص ذیل واقع ہوگا۔

”ایسے لاحقہ یا سابقہ کا رسم خط موصول ہوگا جو مستقل معنی رکھتا ہے نہ دیتا ہے“ سابقہ و لاحقہ کی مختلف صورتیں
 ہوتی ہیں الہی تشبیہ کہ کوئی لفظ افراد غیر مستقل اور ترکیباً مستقل ہو
 (۲) دوسری یہ کہ افراد مستقل و ترکیباً غیر مستقل ہو۔

(۳) تیسری یہ کہ افراد او ترکیباً ہر دو حالت میں غیر مستقل ہو یہ تیسری حالت علامتی مرکبات سے نامزد ہوتی ہے

تمثیل

- (۱) امروز - دیشب - دیروز - ہجولی - دشنام وغیرہ (مرکبات سابقہ جات)
- (۲) مبارکباد - مبارکی - ہیود (بہتری) رقمطراز (رقمی یا قلمی) چالباز (چالیا) خوشنودی (نوشی)
 رفعداد - گوشوارہ وغیرہ۔

ب - دوستدار (دوست) تابعدار (تابع) چیلخورد چیل (فارغبال (فارغ - بالبال (فارغ) دکان
 کیونکر - خاصکر (یہاں جز و دوم یا لاحقہ اپنے اصلی معنی نہیں دیتا)

(ج) (۱) ریشخند - گلبانگ - سیمرخ (سابقہ جات اصلی معنوں میں نہیں)

(۲) خوشبو (سگند) خوشما (سُہانا) دشنام کے سابقہ جات علامت صفت کا کام دیر ہی ہیں -

(۳) جمحار - عنقریب - انجان - کاشتکار - منجملہ - جانور - خاکسار - خوفناک - نگین - گلزار - دھرمشالہ - باگیچن

(پاجی پن) پیشتر - پاندان وغیرہ

مرکبات علاماتی اور رے و ہ کے فارسی مرکبات مثلاً (بیشک - بیچارہ) و (ہمیشہ - ہمدرد وغیرہ مقرر حکمی اور

مرکبات (ہی) بجز حالات خاص

ہر استثنائے علامات { اہل - والا - صاحب - بن - بے (مع وادعطف) نیز علامات جمع فارسی - با وجات
قابل ہائے تخصی - (رکھوالا) (بے شک و شبہ) جامہ ہائے تاجرت

قاعدہ ۳۲ رسم خط ترکیبی کے مضمون زیر بحث کی خارج ہی اس لئے کہ اس کا تعلق مرکب لفظ سے نہیں - یعنی حرف بلحاظ
رابط کلام کے طرفین کا عدیل ہی - وہ دو متصل لفظوں کے درمیان واقع ہوتا ہی اس کا رجحان اتصالی ماقبل کے ساتھ ہوگا نہ
مابعد اس صورت میں بیشک ایک مستقل لفظ کا کام دے سکتا ہی اور رسم خط رواجی ہی اس کا یہی ہی کہ وہ دو متصل لفظوں کے
درمیان الگ لکھا جاتا ہے - مگر جب ضمیر کے ساتھ ہو تو وہ ضمیر کا ایک لائقہ تصور کیا جائیگا اور ضمیر بھی اس کا متعلق علیہ
ہوگا - کیونکہ ضمیر کا لفظ شکلی تغیر کے اعتبار سے حرف ربط سے متاثر ہوتا ہی یا خود حرف ربط متعلق علیہ سمجھا جائیگا - اور
متغیرہ ضمیری الفاظ اس کے سابقہ - کیونکہ ضمائر کی تبدیل شدہ صورت بغیر اظہار حالت فاعلی - مفعولی و اضافی (نے - کو
پر - کا) کے کوئی مستقل معنی نہیں رکھتی ہی - جس طرح تخفیف یا ترخیم لفظی کی حالت میں ایک مستقل لفظ غیر مستقل متصور
ہوتا ہی تو تبدیلی کی حالت میں بھی غیر مستقل سمجھا جانا چاہئے اور جب مثال کن پھٹا و ٹکھٹ کے تخفیف یا ترخیم شدہ لفظ ملاکر
لکھا جاتا ہے - اسی طرح تبدیل شدہ لفظ کو بھی ملاکر لکھنا پڑیگا اور بحالت تبدیل ملاکر لکھے جانے کی تمثیل میں بی بی اور لے ٹو
کے تبدیل شدہ الفاظ بیوی اور لیلوٹ موجود ہیں - علاوہ اس کے اس خصوص میں متغیرہ الفاظ ضمیری کی مثالیں موجود ہیں -

(مچھکو - تچھکو) بنا علیہ - حروف ربط کی بحث قاعدہ (۲) (سابقہ و لاحقہ کے تحت ہونے چاہئے - باستثناء (میں) اور
سے) حروف ربط کا رسم خط ضمائر متغیرہ کے الفاظ کے ساتھ وصل و فصل دونوں طرح سے جاری رہتا رسم خط اردو کی
نسبت عدم یکسانی کا نقص متصور نہیں ہو سکتا ہی - تاہم اس کی کتابت موصول و طباعت مقطوع ہو تو نامناسب نہ ہوگا - تیسرے

قاعدے کو مخصوص تو کیا گیا ہے۔ حروف ربط کے رسم خط سے گزشتال میں بقیہ اقسام حروف عطف وغیرہ سے ہی بحث کی گئی ہے اور اُن حروف کے ریزے ریزے کر دئے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ قاعدہ حروف تخصیص اور حروف عطف کے رسم خط کی اصلاح پر حاوی نہیں ہو سکتا ہے۔ حالانکہ حرف تخصیص (ہی) کا رسم خط بہ اعتبار وصل و فصل کے مختلف فیہ ہے۔ غرض اردو زبان میں بیسیوں الفاظ نے (ہی) کے ترکیب و مستقل لفظ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی طرح اکثر حروف عطف مرکب الفاظ کی صورت میں واقع ہوئے ہیں اور جن کے اجزاء ترکیبی اسماء و افعال مشتمل ہیں اور رسم خط ترکیبی اُن کا بھی مختلف ہی مثلاً نہ کہ۔ نکہ۔ چناں چہ۔ چنانچہ۔ کیوں کہ۔ کیونکہ۔ کیوں کر۔ کیونکر۔ اسلئے۔ اس لئے۔ مع ہذا۔ مہمذا۔ جب کہ۔ جبکہ۔ بل کہ۔ بلکہ۔ حالاں کہ۔ حالانکہ۔ بشرط کہ۔ بشرطیکہ وغیرہ۔

اسی قاعدہ کے تحت حروف تہ اور تہ کا رسم خط مقطوع قرار دیا گیا ہے اور اردو کی مختصر نویسی کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ حروف کہیں تو زائد اور کہیں جزو لفظ کی صورت میں واقع ہوئے ہیں جیسے۔ نہوتی۔ نہوت۔ نذیرہ۔ ہونہو۔ بضد۔ بجز۔ بدولت۔ بموجب۔ بغیر۔ بوضاحت۔ بتدریج۔ بتفاریق۔ متبک۔ بقول۔ بہر حال۔ طور وغیرہ (بدستور بخیر درمیان میں

؛ روبرو۔ جابجا۔ ہوہو۔ خانہ بدوش۔ درجہ بدرجہ۔

حرف تہ۔ افعال کرنا۔ بولنا۔ دینا۔ ہونا کے ساتھ موصول ہوتے ہیں ترکیبی لفظ میں التباس پیدا ہوتا ہے نہ جوڑ میں کوئی بدعنائی پائی جاتی ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر ترکیبی و اتصالی صورت ہی رفع التباس کا موجب ہوتی ہے جیسے رواں ہوا (روانہ ہوا) زنا نہ کر (زنانہ کر)

(سے)

حروف جار و تشبیہ

حروف جار سے اور حرف تشبیہ سے کا رسم خط قابل امتیاز ہونا چاہئے اس لئے مناسب ہو گا کہ حرف جار سے کا رسم خط موصول اور حرف تشبیہ سے کا رسم خط مقطوع ہو۔ مرکب اب حروف عطف کا رسم خط اس اصول پر کہ اُن کے جزئی معنی مقصود نہیں یا ان جزئی معنی ظاہر نہیں ہوتے ہیں موصول ہونا چاہئے

گوشوارہ

رسم خط مرکب الفاظ

مرکبات

الفاظی

علاماتی

مرکب علاماتی کا رسم خط موصول ہو بشرطیکہ رعایت تلفظ اور حسن خط قائم رہے ورنہ مقطوع (فرزہ دلا - بے بسی - کشتی بان - ہم مشرب - ان بن)
 الفاطی - { سالم - غیر سالم (تحفیف یا ترخیم شدہ) }
 سالم - (لفظی - معنوی) نمبر اکا رسم خط موصول - مرکبات مفرد صکی - مرکبات حروف عطف و حرف حصر (ہی) کا
 رسم خط موصول نمبر اکا موصول یا مقطوع -

غیر سالم - (لفظی - معنوی) = نمبر اکا رسم خط موصول - نمبر ۲ کا مقطوع -
 + = مرکبات علاماتی - مرکبات سالم ترکیب لفظی - مرکبات مفرد صکی - مرکبات حروف عطف حصر -
 مرکبات غیر سالم تحفیف لفظی -
 - = مرکبات غیر سالم تحفیف معنوی -
 + = مرکبات ترکیب معنوی -

عدم یکسانی رسم خط

عدم یکسانی کا حصر مرکب الفاظ کے وصل و فصل ہی پر نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اس کا اطلاق املا کے ان الفاظ پر بھی ہوتا ہے جو متحد الصوة اور مختلف الصورت واقع ہوئے ہیں۔

{ وہ الفاظ جن میں ب کا تلفظ مشدد اور ما قبل ن غنہ یا میم ہو }

ایسے ادغامی الفاظ کا املا کبھی میم اور کبھی نون کے ساتھ سنکرت کی طرح آرد وکم خط میں بھی مختلف ہے۔ جیسے
 کھنبا - کھمبا - کنبل - کیبل - چنبر - چمبر - گنبد - گنبد - لنبا - لمبا -

عربی فارسی الفاظ کا رسم خطن سے اور دیگر زبان کے الفاظ کا رسم سے ہونا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عربی، فارسی الفاظ کا رسم خط ہمیشہ ن سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن صرف ایک لفظ زبان فارسی کا ہے کہ اُس کا رسم خط شاید باعتبار اصول ن سے اور باعتبار اصل تم سے ہو کہ گم آباد کا مخفف گمب ہو گیا ہو جیسا کہ رکن آباد کا مخفف رکن آباد اور ہایوں آباد کا ہما آباد ہو گیا ہے۔

تائے منون

تنوینی الفاظ میں تائے منون کا رسم خط کبھی الف کے ساتھ اور کبھی تائے مخفی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے دکالتہ وصالہ۔ اصالتا۔ مگر یہ اختلاف محض اردو کے رسم خط میں دیکھا جاتا ہے عربی کے رسم خط میں نہیں پایا جاتا اور یہ رسم خط ہے بھی عربی ہی کا۔

پس اردو میں بھی اس رسم خط کا تعین از حد ضروری ہے جو حسب ذیل ہے۔

”تائے منون ماقبل متحرک کا رسم خط (ہ) مخفی کے ساتھ ہو اور ماقبل غیر متحرک کا الف کے ساتھ ہو۔“ دکالتہ وصالہ۔ وقتاً۔

(الفاظ متشابه الصوتہ)

متحدہ الصوتہ و مختلف الصوت

(متحد المعنی)

(۱) تیار۔ لیار۔ شطرنج۔ شترنج۔ فیصل و سفیل۔ التصاق۔ التناق۔ قفص۔ قفس۔ تاس۔ طاس۔

خراہین۔ خرائین۔ تننتہ۔ طنطنہ۔ تاباشیر۔ طباشیر۔ مسالہ۔ مصالحہ۔ خیر سلا۔ خیر صلاح۔ صحیح۔ سہی۔ تارم۔ طارم۔ صحنک۔ سہنک۔ مثل۔ مل۔ تشت۔ طشت۔ ذرا۔ زرا۔ رضائی۔ رزائی وغیرہ

متحدہ الصوتہ مختلف الصوت

(مختلف المعنی)

(۲) اسرار۔ اصرار۔ ثواب۔ صواب۔ زکوٰۃ۔ ذکوٰۃ۔ مہووع۔ مبطووع۔ نذر۔ نظر۔ کثرت۔ کثرت

صدا۔ سدا۔ حضر۔ حذر۔ سفر۔ صفر۔ اصراف۔ اصراف۔

(مختلف المعنی)

(الفاظ مشترک)

(۳) خط - خط	{ نظم - نظم	{ عرض - عرض	{ ذات - ذات
لکیر - مکتوب	{ کلام موزوں - بندوبست	{ پوڑائی - معون	{ نفس - درد
صدر - صدر	{ شمار - شمار	{ اثنا - اثنا	{ و غیرہ
بالا - سینہ	{ نشانیاں - دیوار کا دل	{ درمیان - دو	

الفاظ نمبر ایک سے اس امر کی رہنمائی ہوتی ہے کہ الفاظ مختلف صورت کا املا اصلاح طلب ہی اور یہ کہ اصلاح ناممکن نہیں۔ بخلاف اس کے نمونہ الفاظ نمبر ۲ سے یہ پایا جاتا ہے کہ کلیۃً اختلافی صورت کا ارتفاع و اندفاع ممکن نہیں۔ مختلف معنوں کے اظہار کے لئے مختلف صورتوں کا قیام ناگزیر ہے اس کا ارتفاع رموز معنی داری کے خلاف ہوگا۔ یہ مختلف صورت باقی نہ رہی تو وسعت معنی کا وصف زائل ہو جائیگا صدا کا سدا سے اور سدا سے صدا کے معنی کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔ مگر نمونہ الفاظ نمبر ۳ سے نمونہ الفاظ نمبر ۱ کی تائید اور نمبر ۲ کی تردید ہو رہی ہے جس میں سیاق عبارت کے تحت وسعت معنی کا وصف قائم رہتا ہے چنانچہ تقریر میں مختلف معنوں کی تمیز کئے لئے سدا اور صدا کی مختلف اشکال کا معائنہ و مشاہدہ نہایت جیسا کہ تحریر میں ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اسی سیاق عبارت کو اندازہ سے جو تحریر میں ہے ہر ایک لفظ کے مختلف اور جدا گانہ معنی از خود تمیز ہونے لگتے ہیں جو اثر معنی فنی کا تقریر میں ہے وہی اثر تحریر میں بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس خصوص میں تحریر تابع ہوتی ہے تقریر کے۔

ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں کہ جو نہ تو عربی الاصل ہیں نہ عربی النسل مگر پھر بھی عربی پوشش میں نمایاں ہیں۔ جیسے طوطا۔ رضائی۔ صد۔ شصت وغیرہ تو کیا یہ مولد (الفاظ) عربی پوشش کے ذریعہ عربی النسل بن سکتے ہیں۔ حالانکہ اصول تو یہ مانا گیا ہے کہ ”جیسا دیس دیا بھیس“ جس کی نظیر اطر فیض و شطرنج کے الفاظ ہیں اس وقت کی پائی جاتی ہے جبکہ یہاں سے وہ پردیس چلے گئے تھے مگر یہاں تو اپنے دیس میں رہ کر بھی پردیس کا بھیس ترک نہیں کیا جاتا ہے اور خود داری کو خیر باد کہہ دیا گیا ہے بخلاف اس کے خود عربی النسل الفاظ مندرجہ ذیل کس طرح اس مثل کے مصداق بن کر اپنی ہر دلعزیزی اور سیاست دانی کا ثبوت دے رہے ہیں جس میں

ایشیائی اتحاد کی صورت بھی عیاں ہے (قسائی - سہی - مسالہ - سفیل - خیر سلا) یہ بھی کوئی قرینہ ہے کہ تلفظ تو ایک آوازیں اور نمائش ہو اُس کی چار چار صورتوں میں - تلفظ کے میدان میں یہ کوئل گھڑ کس کام آسکتے ہیں -

(ذ - ز - ض - ظ)

گویہی صورتیں عرب میں بھی موجود ہیں اور وہیں کی یہ خود رو بھی ہیں مگر ہر ایک صورت کے لئے ایک خاص صوۃ اور ہر ایک صوۃ کے لئے ایک خاص صورت کا تعین بھی موجود ہے اور ہر صوۃ کا ایک جدا گانہ مخرج بھی ہے جس کا استعمال وہاں نہایت بے تکلفی سے ہوتا ہے - غرض ان تمام متعدد صورتوں (ت - ط - ث - س - ص - ذ - ز - ض - ظ) کا املا وہاں اتنا ہی سہل و آسان ہے جتنا کہ یہاں (ب پ اور د ر) کا - کم سے کم اردو کے معنی سے یہ بدناما صوری تفرقہ تو اٹھ جانا چاہئے - جب ہندوستان میں مشابہ الصوۃ تلفظ تمام مختلف صورتوں کا ایک ہے تو اصول املا کی پابندی کے لئے صرف ایک صورت متحد الصوۃ کی کافی ہے - باقی صورتوں کی تخفیف مناسب معلوم ہوتی ہے چنانچہ بلحاظ سہولت و کثرت استعمال متحدہ الصوۃ حروف سے صرف ایک ایک حرف یا صورت کا حسب ذیل تعین ہو جائے

ز	س	ت
ذ - ز - ض - ظ	ث - س - ص	ط

تاکہ آئندہ صحت املا میں منطقی تاویلات کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے کہ بلحاظ صفائی کے " سفید کا املا (ص) سے ساگوانی " " صندوق " کا املا بلحاظ مادیت کے (س) سے ہونا چاہئے اور نام کے املا کی صحت میں آزادی کامل حاصل ہو جائے کیونکہ جس کے نام کا املا ذ - ض - ظ ہوتا ہے اس کی صحت اُس وقت تک قابل اطمینان متصور نہیں ہوتی کہ صاحب نام کی جانب سے اُس کا تعین و تشخیص ہو کر اجازت عطا نہ ہو - ایسے ناقابل اطمینان صحت کے املاے اردو کے بجائے انگلش یا ہندی رومن کیرکٹر پسند کر لیا جاتا ہے تاکہ عدم صحت املا

کی ندامت نہ اٹھانی پڑے اسی کا نتیجہ یہ ہو کہ اپریل یا جولائی ۱۹۷۰ء سے ممالک اودھ کی عدالتوں سے سرکاری اور عدالتی زبان کا رسم خط اردو سے ہندی میں منتقل ہو چکا مگر پھر بھی اصلاح کی جانب عبرت کی آنکھ نہیں کھلنے پاتی ۔

اصلاح رسم خط

(از جناب پروفیسر محمد نعیم الرحمن صاحب)

”اُردو“ کے چھٹے نمبر میں جناب پروفیسر ہاروں خاں صاحب شروانی کا مضمون بعنوان ”ہماری زبان اور ضرورتِ زمانہ“ شائع ہوا ہے۔ اس فاضلانہ مضمون کو پروفیسر صاحب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:-

(۱) ”اصلاح رسم خط برائے ضروریاتِ زبان موجودہ“ اور

(ب) ”غیر مانوس اعلیٰ اور نئی اصطلاحات کی تحریر کے لئے نئی حرکات و سکنات کی ضرورت“، حصہ اول میں پروفیسر صاحب نے ان مضامین پر تبصرہ کیا ہے جو اس سے قبل اسی موضوع پر ”اُردو“ میں شائع ہو چکے ہیں اور حصہ دوم میں غیر مانوس اعلیٰ ... کے لئے تجاویز پیش کی ہیں۔ مؤخر الذکر حصہ کے مطالعہ سے مجھے غائبانہ اُن کا مشکور ہونا پڑا، کیوں کہ میں نے دیکھا کہ پروفیسر موصوف نے نہایت محنت و کاوش سے فی الواقع نہایت نفیس تجاویز اس باب میں پیش کی ہیں اور اس طرح میں نے اپنے مضمون میں اسی امر پر غور و خوض اور تجاویز کے لئے جو درخواست کی تھی اس پر پروفیسر صاحب نے بہ احسن وجوہ غور فرمایا ہے۔ میں اُن کی تمام تجاویز کی تائید کرتا ہوں۔ اب رہا حصہ اول، اس کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ پروفیسر صاحب نے بالکل سجا فرمایا کہ ”موجودہ ضروریات کا لحاظ کر کے جب ہم اُردو کی اشاعت کے خواہاں اور اسے ہندوستان کی عالمگیر زبان بنانے کے خواہشمند ہیں تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اسے ایسے سانچے میں ڈھلیں کہ جو لوگ اس کا مطالعہ کرنا چاہیں انہیں اشکال و ابہام کا سامنا کرنا نہ پڑے“ اور یہ کہ جو مباحثہ اس وقت اس موضوع پر جاری ہے (اور جو اصلاحِ رسم خط کی کئی صورتوں میں سے صرف ایک اور نہایت ابتدائی صورت ہے) اس کا ”واحد مقصد تمہیں اور دیگر نقائص کو دور کرنا ہے“ حقیقی اصول یہی ہے، اور اسی کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ پروفیسر صاحب نے جناب مولوی عبداللہ یوسف علی صاحب کی مجوزہ ”واو مچول“ (مثلاً جو بہ شکل جو) جناب مولوی سید احمد علی صاحب کی مجوزہ ”یائے مچول“ (یعنی جی کے نیچے ٹوٹنے) اور راقم الحروف کی تجویز کردہ ”یا مچول“ (یعنی جی کے نیچے نشانِ ضرب x) پر اعتراض کرتے ہوئے ان کو ”اصلاحِ معکوس“ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں ان کے اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ اگر ان مجوزہ صورتوں کو اختیار کیا جائے تو سلیبس باقی رہ جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں پروفیسر صاحب کی تجویز یہ ہیں:-

- ۱۔ واو معروف - واو پروا و معکوس - جیسے دُور
- ۲۔ واو مجہول - واو بلا حرکت - جیسے دو - چور
- ۳۔ واو ماقبل مفتوح - حرف ماقبل پر زبر لگا دیا جائے - جیسے فوج - حوض - جو
- ۴۔ یائے معروف - یاء کے نقطوں کے نیچے ایک چھوٹی سی سیدھی لکیر - جیسے کھیر - ہیر
(جب لفظ کا آخری حرف یائے معروف ہو تو سی)
- ۵۔ یائے مجہول - یاء نقطہ دار بلا کسی خاص علامت کے - جیسے تیل - بیر
(جب لفظ کا آخری حرف یائے مجہول ہو تو سی)
- ۶۔ یائے ماقبل مفتوح - حرف ماقبل پر زبر لگا دیا جائے - جیسے پیسا - بیر
(جب لفظ کا آخری حرف یائے ماقبل مفتوح ہو تو سی)
- ۷۔ یائے مخلوط - سی کے نقطے اوپر تلے لکھے جائیں - جیسے کبا - پسا

پروفیسر صاحب نے راقم الحروف کے مجوزہ نشان ضرب (برائے یائے مجہول) پر جو اعتراض کیا ہی وہی اعتراض اسی کمال کے ساتھ پروفیسر صاحب کی مجوزہ یائے معروف پر بھی ہو سکتا ہی: یعنی جس طرح ایک قاری نشان ضرب کو کسی غلط حرف یا نشان وغیرہ کی قطع و برید سمجھ سکتا ہی، ویسے ہی یہ بھی ممکن ہی کہ قاری کو اس ”چھوٹی سی سیدھی لکیر“ میں بھی (جو بسا ممکن ہی کہ شکست خط کی وجہ سے شوشہ ہائے سے مشابہ ہو جائے) تشابہ ہو سکتا ہے تو چوں کہ تلمیس کا شائبہ اس صورت میں بھی دیا ہی باقی رہتا ہی، اس لئے مجھے یہ تجویز بھی پسند نہیں۔ چوں کہ مجھے بلا وجہ اپنی تجویز پر زور دینا مقصود نہیں ہی، اور پروفیسر صاحب کی تجویز بعینہ وہی ہی جو پنجاب میں رائج ہی اور عمومی حیثیت حاصل کر چکی ہی، لہذا مجھے یائے مجہول کے باب میں پروفیسر صاحب سے کلی اتفاق ہی۔

علیٰٰذا القیاس پروفیسر شروانی صاحب کی مجوزہ واو معروف پر بھی بعینہ اسی طرح تلمیس کا اعتراض ہوتا ہی کیوں کہ ان کی مجوزہ ”واو معکوس“ بالائی سطر کے لئے بمنزلہ شوشہ کے ہو سکتی ہی۔ لہذا میں اس کے لئے بھی پنجاب کی مروجہ صورت تجویز کرتا ہوں، یعنی یہ کہ واو معروف کے حرف ماقبل پر پیش دیا جائے۔ اس میں کچھ بھی تلمیس نہ ہو گی۔ اسی طرح پروفیسر صاحب کی مجوزہ یائے معروف بین اللفظ بھی شائبہ تلمیس سے خالی نہیں۔ پس بہتر ہے کہ اس کے

لئے یاے معروف کے ماقبل کے نیچے زیر بنایا جائے۔ اس طرح یہ تلبیس بھی دُور ہو جائے گی۔

بہ نظر اختصار و تشریح میں پنجاب کا رسم خط ذیل میں درج کرتا ہوں:-

۱۔ واو معروف۔ واو معروف کے ماقبل حرف پر پیش لکھا گیا۔ جیسے دُور

۲۔ واو مجہول۔ واو مجہول کے ماقبل حرف پر پیش نہیں لکھا گیا۔ جیسے زور

۳۔ حرف ماقبل مفتوح۔ حرف مفتوح پر وہیں زیر لکھا گیا، جہاں واو یا آئی کے معروف اور مجہول ہونے

کا شبہ پڑتا ہے۔ جیسے غور۔ سیر

۴۔ یاے معروف۔ یاے معروف جو لفظ کے آخری وہ دائرے کی لکھی گئی ہے۔ جیسے کشتی

۵۔ یاے مجہول۔ یاے مجہول کے ماقبل زیر نہیں لکھا گیا۔ جیسے دیر

۶۔ یاے ماقبل مفتوح۔ حسب تفصیل مثال مندرجہ ۳

(۷۔ یاے مخلوط کے لئے کوئی قاعدہ نہیں بتایا گیا)

اس تفصیل کا اگر پروفیسر صاحب کی تجاویز سے مقابلہ کیا جائے تو بہ آسانی واضح ہو گا کہ یہ استثناء واو معروف

یہ تمام تجاویز بعینہ پنجاب کے رسم خط کے مطابق ہیں۔ اسی مطابقت کے اتمام کے لئے میں نے اوپر یہ تجویز کیا ہے کہ

یاے معروف کے اظہار کے لئے اُس کے حرف ماقبل کے نیچے زیر لگا دیا جائے۔ رہی یاے مخلوط، اس میں مجھے

پروفیسر شرذوانی صاحب سے اتفاق ہے، نہ کہ مولانا ہاشمی صاحب سے۔

۲۔ پروفیسر صاحب نے میری پُرانی تجویز ”فائے بلا نقطہ“ اور ”دقائق بلا نقطہ“ پر عدم فرق کا جو اعتراض

کیا ہے، اس سے مجھے سخت تعجب ہوا۔ اس کے جواب میں صرف اسی قدر عرض کرنے کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ ان

دونوں میں وہی فرق ہے جو فا اور قاف کی اصلی صورتوں میں ہے؛ بلکہ عدم نقاط سے یہ امتیاز اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

۳۔ مضمون کے آخر میں پروفیسر صاحب نے راقم الحروف کے ”ہائے حروف“ اور ”حروف غنہ“ کی تجویز پر

ایرا کیا ہے۔ ”حروف غنہ“ کی تجویز محض مشروطی تجویز تھی؛ یعنی یہ کہ بقول ایک مضمون نگار صاحب کے اگر بچوں کو

لے رسم خط کی یہ تشریح پنجاب کے سرکاری مدارس کی تمام کتب کے سرورق کے اندر کی طرف درج ہوتی ہے۔ میں اُسی سے نقل کر رہا ہوں۔

فنی حروف بھی پڑھائے جانے ضروری ہیں، تو کیوں نہ حروف غنہ کو باقاعدہ حرف بتیجی میں شامل کر دیا جائے۔ ورنہ مجھے خود اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ رہی ”حروف ہائے“ کی تجویز۔ میں اس پر اب پھر قارئین کرام کی اسے طلب کرتا ہوں۔ اس بارے میں بطور تشریح مزید اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جس طرح سنسکرت، ہندی اور ہندوستان کی دوسری مماثل زبانوں میں ”ہائے حروف“ حروف بتیجی میں شامل ہیں، کیا وجہ ہے کہ وہ بہ نظر تکمیل بتیجی زد ہیں شامل نہ کر لئے جائیں۔ اور جب ان مخلوط الماء حروف کا اَلْمَلَا دُوحِشْتِی سے کیا جائیگا (جو بہترین صورت طما ہے) تو یہ سوال ہی اٹھ جائے گا کہ ایسی صورت میں الما کیوں کر ہو۔ مدارس میں چند سال کے تجربہ کے بعد مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان حروف کو حروف بتیجی میں ضرور شامل کیا جائے، کیوں کہ ان مخلوط حروف کی اصلیت اور کیفیت کے سمجھنے میں یہاں کے چھوٹے بڑے سب ہی کو ایک سخت مشکل کا سامنا سارہتا ہے اور ان کے لئے یہ مسئلہ نہایت عجیب و غریب ہے (گو خود ان کی دکھنی بول چال میں ایسے مخلوط الماء حروف موجود ہیں، در بعض سادہ حروف بھی مسخ ہو کے گفتگو کے وقت مخلوط بالماء ہو جاتے ہیں !)

اسی ضمن میں پروفیسر صاحب نے ”بائی، تائی، حامی“ (یہی نہیں، بلکہ ”...الح“ بھی) کی تجویز تفصیل عرض کے طور پر کی ہے، خود پروفیسر صاحب سمجھ سکتے ہیں کہ نہ اردو میں ایسے خاص حروف ہیں، اور نہ ان کی وہ تیاری حیثیت ہو سکتی ہے جو مخلوط الماء حروف کی ہے جو بالکل طبعی اور اصلی ہیں۔

۴۔ مخلوط الماء، ملفوظ الماء اور نون غنہ کے الفاظ کے رسم الخط کے باب میں مجھے پروفیسر صاحب اتفاق ہے۔ بہر حال اگر یہ تمام تجاویز اختیار کی گئیں تو نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ پنجاب کا طریقہ رائج ہی اختیار ہوگا، اور میں اس میں عیب تو کچا، خوبی اور سہولت ہی دیکھتا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں اس مضمون کے حصہ اول کو ختم کروں، رسم خط کے ایک اور اہم اور مختلف فیہ مسئلہ کی طرف ارئین کو ملتفت کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد ہائے مخفی کی اس حالت کے الما سے ہے جب کہ ہائے مخفی والے لفظ کے بعد اور اس سے متعلق ہو کر حروف میغزہ (یعنی الفاظ میں، سے، کو، تک، پر، کا، کے، کی، نے والا) میں سے نی آجاتا ہے۔ عموماً اس کی تحریر کی دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں: (۱) اس ہا کو ہا رہی کی صورت میں لکھا جاتا ہے، ”میں“ کے مقابلہ سے معلوم ہوگا؛ (۲) اس ہا کو (زبان اردو کے اصلی تلفظ اور لہجہ کی بنا پر) یا ”میں“ کے مجہول سے

بدل کر لکھا جاتا ہے، جیسے ”مقابلے میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو“، مؤخر الذکر صورت اس وقت نہایت گراں گزرتی ہے جب اس طرح کی ہائے مخفی کے پہلے حرف عین (مملہ) ہو، جیسے ”جمعہ کے دن وعظ ہوگا“۔ ”قرعے سے معلوم ہوا ہے کہ میری ہی باری ہے“ وغیرہ اس لئے ایسی صورت میں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ لکھنے والے بجائے صورت ثانیہ کے صورت اولیٰ ہی استعمال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس بارے میں دو رائیں شاذ ہی متفق ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر اردو نویس لکھتے ہوئے (اور پھر دوران تحریر میں ہر موقع پر مختلف طریق سے) اجتہاد کر لیتا ہے، اور اس وقت جو کچھ اسلوب سے بہتر یا مناسب معلوم ہوتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس کی غیر مطمئن اور صریحاً قابل اعتراض حالت پر ہر ایک ذی ہوش کو ضرور الجھن ہوتی ہوگی۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کا بھی جلد فیصلہ کر لیا جائے کہ ایسے موقعوں پر ہائے مخفی کو باقی رکھا جائیگا یا یائے مجهول سے بدل دیا جائیگا۔ میرے خیال میں مناسب اور اردو لہجہ کے شایانِ حال طریق یہ ہوگا کہ ایسی ہائے مخفی کو، جس کے بعد حروف میجر ہیں کوئی حرف آئے اور اس سے متعلق ہو، یائے مجهول سے بدل دینا چاہیے۔

میں جناب مولوی عبدالحق صاحب کی اس تجویز کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں۔ مگر اس باب میں صرف

تجویز جدیدہ - (۱) پروفیسر شرذوانی صاحب کے مضمون کے آخر میں فاضل اڈیٹر صاحب عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب نے نوٹ منجانب اڈیٹر کے تحت میں ایک جدید اور نہایت دلچسپ مسئلہ پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ آیا اردو حروف تجوی میں ہم آواز حروف کے رہنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ مجھے فخر ہے کہ اس بارے میں میرے خیال کو صاحب ممدوح سے کامل تواریف ہوا۔ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ ”اردو“ کے صفحات میں یہ بحث چھیڑی جائے۔ گو اس کی نوبت اب تک نہ آئی، مگر اکتوبر ۱۹۲۲ء کے آغاز میں مدراس کے ایک علی جلسے میں مجھے زبان اردو کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت میں نے مختصر طور پر (اور مزید تو اردو یہ ہے کہ بعینہ ان ہی دلائل اور جوابات اعتراضات کے ساتھ جو مولوی صاحب موصوف نے پیش فرمائے ہیں) حاضرین جلسہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ میں دورانِ تقریر ہی میں بعض سامعین کے چروں پر طرح طرح کے آثار دیکھ رہا تھا۔ تقریر ختم ہوتے ہی میری توقع کے مطابق، دو پار حضرات نے اس تجویز پر کچھ تو غیظ و غضب کا اظہار فرمایا، اور کچھ تمسخر و تضحیک سے کام لیا۔ اعتراض جو کچھ بھی کئے گئے، میں اُن کو خود ہی پیش کر کے جواب بھی دے چکا تھا۔ بہر کیف مجھے اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ کم از کم باندانان مدراس ہرگز اس تجویز سے متفق نہ ہوں گے۔ واللہ اعلم

ایک اعتراض میرے خیال میں آتا ہے؛ جس کو میں ایک واقع اعتراض سمجھتا ہوں۔ معلوم نہیں اور حضرات کی کیا رائے ہوگی۔ میں اختصار کے ساتھ اپنا خیال پیش کرتا ہوں:-

اس میں شاید ہی کسی کو کلام ہوگا کہ قومیت اور عصبیت کے قیام و ثبات میں دو چیزیں سب سے زیادہ مسدّد معاون ہوتی ہیں: مذہب اور زبان۔ بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ قوم کی حیات کے لئے اتحاد مذہب اور اتحاد زبان لابدی امور ہیں۔ اُردو زبان کے متعلق ہمارا متفقہ (اور بالکل صحیح) دعویٰ ہے کہ یہ ملک ہند کے مسلمانوں کی زبان ہے؛ یعنی یہ کہ ہندوستان کی اس قوم کی متحدہ زبان ہے؛ جو مذہب اسلام کی پیروی ہے۔ اس طرح ہندوستان کی اُردو گو قومِ اسلام پر متحد و متفق ہے؛ اور اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی حاجت نہیں ہے کہ اسلام اور اسلامیت کے اتحاد کی بناءً عربی زبان پر ہے۔ اب ان عربی حروف (یعنی ذ، ض، ظ، ع وغیرہ) کے اخراج کی تجویز پر غور کرنے سے یہ امر بے آسانی واضح ہوتا ہے کہ ہم اس تجویز کے اختیار کرنے سے اپنے حروفِ تہجی (اور بنا بریں تمام اُردو الفاظ) میں سے خالص عربی حروف کو خارج کئے دیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اُردو گو یاں ہند (یعنی مسلمانوں) کو پہلے تو قرآن کی تعلیم و تعلّم میں سخت تکلیف کا سامنا ہوگا؛ پھر عربی زبان کے حصول میں جو اشکال پیدا ہو جائیں گے، اس کی وجہ سے قوم کا صرف ایک نہایت ہی محدود حصّہ عربی کی کتب وغیرہ سے مستفید ہو سکے گا۔ پھر دوسری طرف جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُردو میں عربی زبان کا کس قدر زبردست حصّہ موجود ہے؛ اور دن بہ دن (علاوہ یورپی زبانوں کے) اس کا عنصر اور بھی زیادہ دخیل ہوتا جاتا ہے اور باعثِ سہولت یہی ہے؛ تو وہ وقت کچھ دُور نظر نہیں آتا کہ فی الحال جس قدر الفاظ عربی کے اُردو میں موجود ہیں ان سے زیادہ کی درآمد مسدود ہو جائے گی؛ اور اگر کوئی مصنف، مؤلف یا مقرر اُن کو استعمال کرے گا تو وہ قارئین یا سامعین کو سخت دقت میں ڈال دے گا۔ ان اسباب و وجوہ پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اپنے مذہب اور مذہبی روایات کے تحفظ و بقا کے لئے؛ بلکہ ایک حد تک خود زبانِ اُردو کی توسیع و ثبات کے لئے ان عربی حروف کا باقی رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور امر بھی ضروری طور پر غور طلب ہے؛ جسے بہ لحاظ مقصد اسی تجویز کی ایک شق سمجھنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ان عربی حروف کے زائد از ضرورت اور دوسرے حروف موجودہ سے (جن کو اہل اُردو بآسانی ادا کرتے ہیں) ہم آواز ہونے کی بناءً پر خارج کر دینے کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مناسب ہوگا یا نہیں کہ عربی کے جن

مُرکبات میں ال تعریفی ہوتا ہی (اور جن کا استعمال اُردو میں اسماء معروفہ کے طور پر بالخصوص اوردو سہری طرح بالعموم ہوتا ہی) اُن کو عربی رسم خط کے مطابق نہ لکھا جائے بلکہ حرف لام کو لفظ ماقبل کا آخری حرف خیال کیا جائے۔ یا اگر اس لام کے بعد کا حرف شمسی ہی تو وہی حرف لکھا جائے؛ مثلاً عبد العظیم کو ٹیٹ اُردو لہجہ پر بحسب تجویز بالا اُبدل اِزیم اوردو اسطنت کو دُا اُس سلنت لکھا جائے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسا کرنا بہتر ہوگا؛ کیوں کہ عربی کے حرف زائدہ کا اخراج تیش تلفظ، سہولت املاء اور ازالہ تبلیس پر مبنی ہے، اسی طرح عربی کے معرف باللام الفاظ کی اس نوع کی تقسیم و قطع بھی ان مقاصد کو حصول میں معاون ہوگی۔ فانظرہا
برکع اس دلچسپ موضوع پر دیگر حضرات اہل الرائے کی راؤں کو ضرور سن لینا چاہیے۔

۲۔ میں اسی سلسلہ میں ایک اور امر کی طرف اہل اُردو کی توجہ کو مبذول کرنا چاہتا ہوں، اوردوہ اوقاف قرأت کا مسئلہ ہی۔ گو اس کو رسم خط سے براہ راست کوئی تعلق نہیں؛ لیکن اصلاح رسم خط کی بحث جس بنا پر مبنی ہی، اور جو غرض اس کی تکمیل سے متصور ہی، بلاشبہ اس میں اوقاف قرأت کا مسئلہ اس سے ضرور وابستہ ہی اور اس کے حل ہو جانے سے اس کی تکمیل ہو جائے گی۔

زبان کی تحریر میں اوقاف قرأت کا ہونا ایسا امر ہے جس کی ضرورت سے کوئی صحیح الفکر انسان انکار نہیں کر سکتا۔ پھر بالخصوص اُردو کی تحریر میں ان کا نہ ہونا جن مشکلات کا باعث ہوتا ہی، وہ ہمیں معلوم ہی ہیں مگر بنات حیرت کی بات ہی کہ اب تک اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ رسالہ مکشاں مرحوم (لاہور) میں موی سید ممتاز علی صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا تھا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہی، کسی اہل قلم نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو تحریروں میں چند ایک اوقاف ضرور استعمال ہوتے ہیں، مثلاً قلمے (Commodes) ہی جن کا وجود علامہ شبلی مرحوم اوردو المصنفین اعظم گدھ کی کتب میں بالخصوص پایا جاتا ہے) قلمات معکوسہ، ندائیہ، سوالیہ اور معترضہ (خطوط وحدانی) مگر یہ استعمال یا تو بہت کم ہی یا (خصوصاً قلمے کا حال تو یہی ہی کہ) غیر منضبط طور پر متصل ہی اور زیادہ تر کاتب صاحب کے رحم پر چھوڑ دیا جاتا ہی۔ میں تجویز کرتا ہوں شاید شمالی ہند کے حضرات اس سے پوری طرح متفق نہ ہوں گے مگر جنوبی ہند میں اوریاں کے حالات و کوائف کے لحاظ سے اس قول کی جواہریت ہی، کاش کہ وہ اس سے آگاہ ہوتے۔

ہوں کہ تمام اوقات قرأت کا استعمال اُردو تحریر میں جاری کیا جائے، اور اسی تفصیل اور تشدید سے جاری کیا جائے جیسا کہ انگریزی میں ہے۔

لہذا میں ذیل کی تجاویز ناظرین کے غور کے لئے پیش کرتا ہوں :-

۱۔ اوقات اور اُس کے لئے رسم تحریر :-

(۱) انگریزی کے تمام اوقات استعمال ہوں۔

(۲) تمام اوقات کی وہی شکلیں ہوں جو انگریزی میں ہیں۔ مگر چوں کہ :-

۱۔ کامہ (Comma)، اویسی کولن (Semi-Colon) میں واو اور ذال سے تشابہ ہوگا،

اس لئے ان دونوں کو انگریزی کی معکوس صورت میں اس طرح لکھا جائے (؛) :

(ب) سوالیہ کی شکل اُردو فقرے کے بعد الٹی سی معلوم ہوگی، اس لئے اس کا اس صورت میں استعمال

کیا جائے جیسا کہ اُردو میں رائج ہے (؟)

ب۔ تسمیہ اوقات :-

اب سوال یہ ہے کہ ان کا مجموعی اور تفریدی نام کیا ہوگا۔ میں نے اب تک انھیں ”اوقات قرأت“ کہا ہے

ایران کے جدید فارسی والوں نے ان کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ وہ اس عمل کو ”اعجام“ اور اس کے مختلف

اجزاء (قامہ وغیرہ) ”اشارات اعجام“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے دو تیار بنی بنا

نام موجود ہیں : اوقات اور اعجام۔ مجھے ان میں سے اول الذکر پسند ہے، اور اسی کے اختیار کرنے کی تجویز

کرتا ہوں، اب رہی مختلف اوقات کے نام، ذیل کی جدول سے اس کی تشریح ہوگی :-

علامت	فارسی نام	میری تجویز	انگریزی نام
،	سکتہ یا فاصلہ	قامہ	Comma
؛	مفردہ یا نقطہ	مفردہ	Semi-Colon
.	نقطہ یا فاصلہ	نقطہ	Period
:	دونقطہ یا شارحہ	شارحہ	Colon

علامت	فارسی نام	میری تجویز	انگریزی نام
—	رابطہ	رابطہ	Hyphen
—	فارقہ	دیش	Dash اور
()	مقترضہ	مقترضہ	Parenthesis
[]	تفریقیہ	تفریقیہ	Brackets
؟	استفہامیہ	سوالبہ	Query
!	تعجبیہ	ہدائیہ	Interjection
.....	نقاط انصرافیہ یا تقدیریہ	نقاط تقدیریہ	Dots of omission
” ”	میمزہ	قامات معکوسہ	Inverted Commas

ان میں سے پہلے دو اوقات کے سوا سب تحریر کی سطر پر بنائے جائیں، اور پہلے دو سطر کے اوپر یعنی تحریر شدہ الفاظ کے حصہ اعلیٰ کے برابر۔ اس تجویز کے متعلق میں دیگر حضرات کی رائے کے لئے چشم براہ رہوں گا۔ اوقات کے جو نام میں نے تجویز کئے ہیں، فارسی اسماء کے مقابلے سے معلوم ہو گا کہ سوا پانچ صورتوں کے باقی سب فارسی ہی سے مقتبس ہیں۔ لیکن اگر ان سے بہتر اور سہل تر نام تجویز ہوں تو میں اپنے مجوزات پر زور نہ دوں گا۔ صرف اس قدر البتہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اسماء ان اوقات کے فعل ذاتی کے منظر بھی ہیں اور بہتر ہو کہ حضرات مجوزین اس امر کو ضرور پیش نظر رکھیں۔ میں نے اپنی کتاب 'خلافت موحدین' میں ان تمام اوقات کا باقاعدہ استعمال کیا ہی، اور جہاں تک مجھے خیال ہی یہ کتاب اردو ادبیات میں پہلی ہی کتاب ہے جس میں یہ التزام کیا گیا ہی۔

پروفیسر شروانی صاحب اور مولانا مولوی عبدالحق صاحب کی اس تجویز پر میں بار بار زور دینا چاہتا ہوں کہ رسم خط کے متعلق جب تمام آراء وصول ہو چکیں، تو پروفیسر صاحب کی مجوزہ جماعتوں سے ایک یا زائد نمائندہ کو طلب کر کے ایک باقاعدہ جلسہ کیا جائے جس میں یہ تمام بنیادیں معرض بحث میں آئیں۔ پھر جو کچھ طے پائے اس کو انجمن ترقی اردو کی جانب سے وسیع پیمانے پر شائع کیا جائے، اور زور دیا جائے کہ آئندہ تمام مطبوعات اسی اسلوب پر ہوں۔ اب

دیکھنا یہ ہے کہ اس میں اہل اُردو کہاں تک سرگرمی سے کام لیتے ہیں۔

انجناب سید الطاف حسین صاحب کاظم۔ (دہلی)

جیسے

رسالہ اُردو ماہ جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک مفید و دلچسپ مضمون ہماری نظر سے گزرا تھا جو عزیز می و سعیدی مولوی
علی صاحب فرید آبادی کے ذہن نقاد کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون عبداللہ یوسف علی صاحب کے مضمون تجویز اصلاح
الخط کے جواب میں لکھا گیا ہے اس لئے اس مضمون کا بھی یہی عنوان رہا۔ حالاں کہ جن مسائل پر مضمون مذکور میں
بحث کی گئی ہے ان کے لحاظ سے عنوان کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔

اگرچہ پہلا مضمون ہمارے سامنے نہ ہونے کے باعث ہمیں خوف ہے کہ شاید ہم اس مفید مسئلہ پر خاطر خواہ اپنے
خیالات کا اظہار نہ کر سکیں گے، تاہم اس امید پر کہ مضمون ہذا شائع ہونے کے بعد غالباً دونوں صاحبوں کی نظر سے
گزرے گا۔ ممکن ہے کہ تبادلہ خیالات کا کوئی سلسلہ قائم ہو سکے حتی المقدور ہم اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں جو عجیب و
مغرض دونوں کے خیالات سے علیحدہ ہیں۔

عزیزی مولوی سید ہاشمی صاحب نے اصل مضمون کے پہلے حصہ کے متعلق لکھا ہے کہ عبداللہ یوسف علی صاحب کی
راے ہے کہ مرکب الفاظ کے جو اجزاء ترمیم ہو کر اب مستقل لفظ نہیں رہے ان کو علیحدہ علیحدہ لکھنا چاہیے مگر ہم کو اس سے
اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک پُر گھٹ کو ملا کر (پنگھٹ) لکھنا چاہیے۔ البتہ وہ اجزاء مرکبات جو اصلی حالت میں معنی
لفظ ہوں وہ جدا جدا لکھے جانے مناسب ہیں۔ جیسے کام چور شیخی خور۔

ہمارے نزدیک سید ہاشمی صاحب کی رائے بالکل درست ہے اور اُردو رسم کتابت کے لئے یہ قاعدہ بالکل موزوں
و مناسب ہے۔ امید ہے کہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے بھی اس کو پسند فرمایا ہوگا۔

اصل مضمون کے دوسرے حصہ کے متعلق جو جواب دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کا یہ حصہ رسم خط
کے نسبت علم ہما سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اس پر سید ہاشمی صاحب نے مختصر و مجملاً وہی لکھا ہے جو ہم اُردو قاعدہ کو
دیباچہ میں مفصلاً لکھ چکے ہیں یعنی آی اور و مجہول پر کوئی حرکت موافق یا مخالف نہ سمجھنی چاہیے اور سب کچھ کرتے وقت
بچہ کو ذہن نشین کر دینا چاہیے کہ ایسی واؤ یا یا کے ماقبل حرف پر زیر بر زیر پیش کچھ نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ صرف حرف علت
ہی کی وجہ سے یہ وسطی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔

اُردو زبان میں یا ساکن کی عموماً تین آوازیں ہیں۔ سیر۔ سیر۔ سیر جن میں سے صورت سوم کو یا معروف اور دوم کو مجهول کہا جاتا ہے صورت اوّل کا کچھ نام نہیں ہے۔ اس لئے عربی فارسی میں خواہ کچھ ہوا، دو کی تقسیم اس طرح مناسب ہوگی کہ اوّل کو مجهول دوم کو وسطی سوم کو معروف کہا جائے۔

حروف علت کی خاصیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الف زبر کا دو چند ہوتا ہے اور یا زبر کا اور واؤ پیش کا۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ زبر تینوں حرف علت کے ماقبل پر آتا ہے الف کے ماقبل پر حرکت موافق کی طرح اور واؤ اور یا کے ماقبل پر مخالف حرکت کے طور پر مگر زیر اور پیش حرکت مخالف کے طور پر کسی حرف علت کے ماقبل پر کبھی نہیں آتے صرف موافق حرکت بن کر آتے ہیں۔ چنانچہ الف کے ماقبل پر زبر کے سوا زیر یا پیش کا ہونا محال ہے اور واؤ اور یا کے ماقبل پر زبر کا ہونا ممکن ہے۔ لہذا یا، مجهول وہ یا ہے جس کے ماقبل پر زبر ہو جیسے سیر یا معروف وہ یا ہے جس کے ماقبل پر زیر ہو جیسے سیر یا وسطی وہ یا ہے جس کے ماقبل پر کچھ ہو جیسے سیر آگے چل کر مضمون ثکور میں حروف تہجی کی بحث چھڑ جاتی ہے اور یہ ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ دو تہجی کے حروف ثقیلہ (جد۔ پچھ۔ تہ و غیرہ) بڑھا کر پنجاب والوں نے ایک اور بے اصولی پیدا کر دی ہے۔ عربی و فارسی میں تو ان آوازوں کی ضرورت نہیں تھی جو ہماری تحریر کے اصل واضعین ان کے لئے خاص حروف وضع کرتے۔ ہاں ہندی زبان میں ایسی بہت الفاظ ہیں جن میں دو حرف کی مل کر ایک آواز پیدا ہوتی ہے ہمارے نزدیک یہ الفاظ دینی زبان سے اس امر کا اقرار ہے کہ حروف ثقیلہ حروف تہجی میں شامل ہوئے چاہئیں کیوں کہ عربی و فارسی کے اس قدر دیرینہ قبضہ پر اور انگریزی ترکی کی اس بلغار پر روزمرہ اُردی میں بھاشا الفاظ کی تعداد چند در چند ہی ان حالات پر اسل واضعین کا فرض تھا کہ ان آوازوں کے لئے حروف وضع کرتے اگر ایسا نہیں کیا تو فرض ادا نہیں کیا اسی غفلت کا نتیجہ ہے کہ اُردو علم ہجائیں لا علاج مشکلات پیدا ہو گئی ہیں چنانچہ آج لفظ ہنس اور ڈنر کے ہجے کوئی طالب علم تو کیا مطلوب علم ہی نہیں کر سکتا۔ آخر مجبور ہو کر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہجوں کا طریقہ بدل جائے۔ لیکن جب حروف ثقیلہ اور حروف غلہ کا بڑھانا اس لئے ناجائز ہے کہ اصل واضعین نے اُن کو شامل نہیں کیا ہے تو اس مقدس خیال کی بنا پر ایسے ہجوں کا جاری کرنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے جو اصل واضعین کے طریقہ خلاف ہوں گے۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ حروف ثقیلہ اور غلہ بڑھا کر بہت سے لائیکل مسئلوں کو حل کر دیا جائے جس سے تمام مشکلات کا خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد موقوف

سید ہاشمی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ عا۔ ت۔ ہی تین حرف لیے ہیں کہ دوسرے حرفوں کے ساتھ مل کر ان کی جداگنا ہستی قائم نہیں رہتی۔ یہ بات عا اور ت کی نسبت بالکل درست ہے مگر ہی کی نسبت ہمیں کلام ہی اور ہم سید صاحب کو اس پر دوبارہ غور کرنے کی تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ کیاری۔ پیاری۔ پیاس۔ بیاج وغیرہ جن الفاظ میں سید صاحب نے خیال کیا ہے کہ ہی کی ہستی قائم نہیں رہتی ان سب میں ہی کی ہستی تو بخوبی قائم رہتی ہے مگر ہی کے ماقبل حرف کی آواز اُدھی رہ جاتی ہے۔ اس کی بابت اصولیوں سمجھنا چاہیے کہ حرف یا کسی سے ملتا ہے یا کسی کو ملتا ہے۔ ایک کو متحرک کہتے ہیں دوسرے کو ساکن؛ اس ساکن و متحرک کی بقاعدہ حصر عقلی چار صورتیں ہوتی ہیں جن میں سے کسی نہ کسی میں ہر حرف کا ہونا لابد ہے۔ وہ چار صورتیں یہ ہیں۔

(۱) فقط متحرک جیسے نقال کا نون

(۲) فقط ساکن الف " " " "

(۳) متحرک بھی ساکن بھی (مُشدّد) قاف " " " "

(۴) نہ متحرک نہ ساکن (موقوف) لام " " " "

جس طرح مُشدّد اور ساکن کبھی کلمہ کے شروع میں نہیں آتے اسی طرح متحرک اور موقوف کلمہ کے شروع میں آتے ہیں۔ اس حالت میں موقوف کا نام ہم نے مُعَرَّا رکھا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اس پر زبر نہ پیش کیجے نہیں ہوتا۔ پیار۔ پیاس وغیرہ الفاظ میں پ حرف سر کلمہ مُعَرَّا ہے اور اس کے ہجوں میں کوئی حرکت نہیں دی چاہیے صرف حرف کا نام لینا کافی ہوتا ہے عجیب دلچسپ بات ہے کہ ایسے مُعَرَّا سر کلمہ ہمیشہ بلا استثنا ہی آواز حرف علت کے قبل آتے ہیں جیسے پیار۔ کوار اور اس واؤ یا ہی کے بعد الف بھی ضرور ہوتا ہے نہ اردو میں حرف علت اور حرکت کے تعلقات اگر مکمل طور پر قلبند رکے جائیں تو زبان عربی کے تعلیمات سے کم نہ رہیں گے۔ چنانچہ آواز کا تفاوت ایک اور بھی نہایت قابل لحاظ ہے۔ کوڑی۔ اور کوآ دو لفظ ہیں جن کے اوّل میں دونوں جگہ کاف مفتوح مع حرف علت واؤ موجود ہے فرق صرف یہ ہے کہ کوآ کا حرف علت مُشدّد ہے اور کوڑی کا حرف علت ساکن ہے اس کا اثر یہ ہے کہ کوڑی میں تو کاف زبر واؤ کو کہا جاتا ہے اور کوآ میں ان ہی دو حرفوں کی آواز گنبد کی طرح لڑکتی ہوئی نکلتی ہے۔ جب ہتجے ہوتے ہیں۔ پھر فقط کوآ میں ہی نہیں بلکہ کُلیّہ کے طور پر جہاں دو متواتر حرف

علت جمع ہو جائیں گے اور پہلا حرف علت مشدّد اسی طرح کی آواز پیدا ہو جائے گی جیسے پتیا اور پیادونوں میں پت مفتوح مع حرف علت ہی موجود ہے مگر ہتھوں میں آوازیں مختلف ہیں۔

بات یہ ہے کہ انسان نے حروف تہجی بول کر زبان نہیں سیکھی ہے بلکہ جملے بولے ہیں۔ اس لئے خالص مفرد حرف کی آواز ادا کرنا اس کے فطرت کے خلاف ہے اور کیسا ہی تکلف کر کے حرف کی خالص آواز ادا کرنا چاہے خود بخود اس حرف پر کوئی حرکت تلفظ میں پیدا ہو جائے گی۔ حرف مفرد بلا حرکت صرف اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے جب کہ اس کے بعد واؤ یا تہی حرف علت ہو اور اس کے بعد الف بھی ہو۔ جیسا کہ پیار کی پت اور کوہار کا کاف اور بیاج کی تے۔

حرف استفہام (کیا) اور کرنا کی ماضی مطلق (کیا) پر غور کیجئے۔ تہی دونوں کے تلفظ میں صحیح و سالم موجود ہے مگر جس طرح ماضی مطلق (کیا) کا کاف صاف معلوم ہوتا ہے حرف استفہام (کیا) میں نہیں معلوم ہوتا بلکہ آدھا رہ جاتا ہے اور بیشک آدھا رہنا چاہیے۔ کیوں کہ وہ موقوف یا معرّی ہے اور جب کہ مشدّد متحرک بھی ہوتا ہے اور ساکن بھی اس لئے دو چند حرف ہوتا ہے تو موقوف یا معرّی جو نہ متحرک ہوتا ہے نہ ساکن حساب سے نصف رہنا چاہیے۔ تعجب ہے اور سخت تعجب ہے کہ ایسے حروف سرکہ کو پنجاب یونیورسٹی کے منظور شدہ اُردو قاعدوں میں ساکن لکھا ہے۔ حالاں کہ ساکن حرف سرکہ ہونا محال ہے کیوں کہ ساکن سے پہلے ایک متحرک کا ہونا لازمی امر ہے۔

جس طرح حرف مفرد محض کا تلفظ کرنے میں خود بخود کوئی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حرف مفرد متحرک محض کا تلفظ کرنے میں خود بخود اس حرکت کا مماثل کوئی حرف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہم نے اپنے جدید قاعدہ میں اُستادوں کو بتا کہ یہ ہدایت کی ہے کہ قطب کے ہتھوں میں قاف پیش تو ط پیش ب ط ب قوطب بچے نہ کہنے پائیں۔ بلکہ قاف پیش ط پیش ب ایک دم قطب کہنا چاہیے۔ مضمون کے آخر میں مولوی سید ہاشمی صاحب نے ہتھوں کا طریقہ بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں گھر کے ہتھ اس طرح کرائے جائیں۔ گ۔ ہ۔ پ۔ ا۔ ا۔ جزم گہ (تلفظ گھ) اور گہ۔ ز۔ ز۔ بر گھر گویا حروف ثقیلہ اور غنّہ تہجی میں نہ بڑھائے جائیں۔ بچے خود اسی وقت اوّل حرف ثقیل بنایا کریں پھر بچے کر لیا کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غنّہ اور ثقیل تمام آوازوں سے بچے عرصہ دراز میں رفتہ رفتہ آشنا ہوں گے حالاں کہ اصولاً تمام مفرد آوازیں اور ان کی شکلیں حروف تہجی ہی میں آجانی چاہئیں۔

اگر یہ صرف اس لئے گوارا ہے کہ حروف تہجی زیادہ نہ ہونے پائیں تو ہمارے نزدیک حروف صحیحہ میں سب سے کم ہو سکتے ہیں۔ اُن کے کم کرنے کی طرف توجہ کیوں نہیں کی جاتی۔

اگر ان بچوں کے وقت ہمارا دیباچہ سامنے رکھ لیا جاوے تو بہت سا وقت ضائع ہونے سے بچ جائیگا اور مباحث جلد کسی مستقل نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔

آخر میں مولوی سید ہاشمی صاحبؒ ہمنوا ہو کر ہم بھی عرض کرتے ہیں کہ کسی نے قاعدہ کو منتخب کرنا اور تمام صوبوں کے تعلیمی محکموں سے خط و کتابت کے بعد اس کو کتب درسی میں رواج دینا انجمن ترقی اُردو کا کام ہے ورنہ کوئی تجویز یا اصلاح اُردو تحریر میں عام طور پر مروج و مستعمل نہیں ہو سکتی۔

تفہیم

از جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی۔ پرنسپل عثمانیہ کالج۔ حیدرآباد۔ دکن؛

ارایش زین ٹماکس یعنی ”عربی نحو“ تصنیف ہ۔ ریکین دوزف۔ اشاعت خانہ کارل وون ٹر،
ہائیڈل برگ (جرمانیا) ۱۹۰۸ء + ۵۵۷ صفحے قیمت: تقریباً ۱۸ روپے۔

(Die Arabische Syntax von H. Reckendorf)

Carl Winter, Heidelberg, GERMANY)

اس مالی مصیبت کے زمانے میں جرمانوں کی علمی اولوالعزمی پر ہزار آفریں کہ ایسی کتابیں بھی برابر شائع
کر رہی ہیں جن کے پڑھنے والوں کی تعداد اس ملک میں بہت محدود ہے اور اس لئے ان کی اشاعت کسی مالی
فائدے کی زیادہ امید نہیں۔ اسی زمرے میں جامعہ فرای برگ (Freiburg) کے سامی لسانیات
کے اُستاد، پروفیسر ہ۔ ریکین دوزف کی تازہ تصنیف ”عربی نحو“ بھی شامل ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے تک مصنف موصوف کی دو اور تصنیفیں بہت مشہور تھیں۔ ایک
پارونوماسیہ ان دین زمیٹین اشرفین (Die Paronomasie in den semitischen Sprachen)

یعنی ”سامی زبانوں میں تکریر“ دوسرے (Die Syntaktischen Verhältnisse des Arabischen) یعنی ”عربی کے نحوی تعلقات (یا کیفیات)“ اس دوسری کتاب کا موضوع بھی گویا وہی ہے
جو کتاب زیر تبصرہ کا لیکن دونوں کے طرز بیان اور احاطہ عمل میں بڑا فرق ہے۔ شواہد کا مواد جو دونوں میں
جمع کیا گیا ہے وہ بھی ایک نہیں۔ غرض کہ ایک کتاب دوسری سے مشتغلی نہیں کرتی بلکہ دونوں ایک دوسری
کی تکمیل کرتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے: پہلے میں سادہ جملوں اور اُن کے مختلف اجزاء کا بیان ہے اور دوسرے میں مرکب یا ملتف جملوں کی تشریح۔ پھر ہر حصے میں چند تفصیلیں ہیں۔ ہر فصل کے آغاز پر اُس کے متعلق عام نحوی اصطلاحیں اور ضروری مراتب جرمانی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھ دیئے ہیں۔ اور پھر عرب کے مستند کلام سے شواہد جمع کر کے اُن کو صحیح عنوانوں کے ذیل میں جگہ دی ہے اور ہر شاہد کا اعتیاد کے ساتھ حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ پُر مغز کتاب ساری کی ساری طول و فضول سے معرا ہے اور ترتیب ایسی خوب ہے کہ استفادہ کرنے والے کو بے ضرورت لفظوں اور پیچیدہ جملوں کی بھول بھلیاں میں پڑے بغیر مطلوب مقصود ہاتھ آجاتا ہے۔ شواہد اور تمام عربی لفظ عربی ہی خط میں لکھے ہیں اس لئے یہ کتاب اُن لوگوں کے لئے بھی ہرگز بے کار نہیں جو جرمانی نہیں جانتے اور اسی لئے میں نے مناسب جانا کہ ”اُرڈو“ کے ذریعے اُن حضرات کو بھی جو جرمانی نہیں پڑھ سکتے اس پیش باب خزانے کی خبر پہنچا دوں۔

حیدرآباد کا ایک مشاعرہ

گزشتہ ماہ فروری میں ہمیں حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ عام مشاعرہ نہ تھا بلکہ بے تکلف اور سخن سنج احباب کی ایک دلچسپ صحبت تھی جس میں بعض غیر طرچی غزلیں بھی پڑھی گئیں۔ مصرع طرح :
 ”کہاں سے لائے گا قاصد بیاں میرا زباں میری“

ایک پامال زمین تھی مگر اس میں بھی بعض حضرات نے بہت اچھے اچھے شعر کہے تھے۔ ہماری درخواست پر بعد میں قریب قریب سب غزلیں ہمارے پاس بھیج دی گئیں کہ ناظرین اردو کی دلچسپی کے واسطے ہم ان غزلوں کے منتخب اشعار اس رسالے میں شائع کر دیں۔

مشاعرے میں سب سے زیادہ داؤد حکیم عابد حسین صاحب عابد کے حصے میں آئی۔ آپ لکھنؤ کے ایک نامور خاندان کی یادگار ہیں اور غزل نہایت خوب لکھتے ہیں۔ زبان کی سلاست و صفائی کے علاوہ جو تغزل کی جان ہے، حضرت عابد کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کوئی شعر سوز و گداز کی کیفیت سے خالی نہیں ہوتا۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں :-

کہانی رنج و غم کی اور پھر طرز بیاں میری !	بہت روئے وہ سن کر میرے منہ سے داستان میری
اکہی کس طرح فریاد چھینے اُن کے کانوں تک	کہ بیگانہ ہی راہ و رسم منزل سے نفاں میری
اٹھا تھامے ہوئے دل اٹھ کے بیٹھا، بیٹھ کر اٹھا !	تری دہلیز پر اللہ رے بتیا بیاں میری
ہزاروں خوابیاں ہیں ایک مرجھائے ہوئے دل میں	بہارِ گلشنِ عالم سے بہتر ہی خزاں میری
خدا سمجھے نشانِ قبر بھی رکھا نہ ظالم نے	یہ میری بکسی اور اس پہ یہ بربادیاں میری
کوئی تازہ مصیبت سر پہ شاید آنے والی ہو	بہت جھک جھک کے صورت دیکھتا ہے آسماں میری
وقائعِ عشق یہ بے آبرو ہونا محبت میں	مرا سرمایہ غرت نہیں بے تابیاں میری

یہ حسرت ہر دعا و دوں فوج ہوتے ہوتے قاتل کو خداوندانہ پنج بھی گویا ہو زباں میری

مصیبت کا ہر افسانہ غزل کہے کو ہر عابد

مرصع ہر غم و رنج و الم سے داستاں میری

سلاست بیان اور تغزل کے ذکر میں ہمیں اپنے عزیز میزبان اور صاحب مشاعرہ سیدنا راجہ صاحب مزاج کے شعر یاد آئے۔ آپ حضرت داغ مرحوم کے شاگرد ہیں اور اس خصوصیت میں اپنے بالکمال استاد کے پیچھے وارث ہیں کہ محض سلاست اور حسن بیان کے زور سے شعر میں لطف و حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے طوالت کے خوف سے طبع کی غزل میں سے حضرت مزاج کے صرف چند شعر انتخاب کرنے پر اکتفا کیا:-

وہاں عرض تمنا پر بھی رکتی ہے زباں میری	زبان خامشی تو ہی سنا دے داستاں میری
تمنا مجھ پہ ہنستی ہے وہ ناکام تمنا ہوں	حقیقت ہے عزیز و عبرت آموز جہاں میری
اثر ہے اضطرابِ شوق کا دونوں طرف یکساں	ترپ ہے اُن کے جلوے کی کہ ہیں بتابیاں میری
مری چشم تماشا محو خوابِ زندگانی ہے !	خیالِ یار سے ہوتی ہیں بزمِ آرائیاں میری
میں مرنے کے لئے جیتا ہوں جینے پر نہیں مرتا	سنا اہل ہوس ! یہ ہے حیاتِ جاوداں میری
جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کی شکایت کیا	یہ دل ہے مدعی میرا یہ دشمن ہے زباں میری

دوا اور صاحب جن سے مشاعرے کی زینت ہے اور جن کے بغیر اس محفلِ یاراں میں پوری رونق نہیں آتی حضرت ضامن کنٹوری اور صاحب عالم مرزا نظام شاہ صاحب لبیب دہلوی ہیں۔ حضرت ضامن اردو اور فارسی کے قادر الکلام اور مشہور مشاق سخن گو ہیں اور ان کے شعر میں استادانہ نچنگی کی شان موجود ہے۔ ہمیں ان کا اردو دیوان 'ارتنگ خیال' حال ہی میں ملا اور امید ہے ان کی شاعری کے متعلق ہم کسی آئندہ موقع پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کر سکیں گے۔ ہمارے مخدوم مرزا نظام شاہ صاحب کارنگ دوسرا ہے اور تصوف کے تازہ ذوق نے ان کے شعر میں کچھ اور ہی کیف و اثر پیدا کر دیا ہے۔ ذیل میں دونوں صاحبوں کے بعض شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

حضرت ضامن گنتوری :-

یہ اندیشہ ہی حق کہہ کر نہ جائے مفت جاں میری
عجب کیا کر بنے وہ بزم عشرت حلقہ ماتم
کہوا قرار جاں بخشی تو گویا ہو زباں میری
بہار رنگِ سُخ ایسا نہ ہو کافور ہو جائے
زباں تیری ہوئے افسانہ گوار داستان میری
کسی سے کیوں کہے کوئی حدیثِ نوچکاں میری
فلے آبِ گل سے کیا ضرر صاحبِ کمالوں کو
تھنا کے جور سے امین ہی عمر جاوداں میری

حضرت لبیب دہلوی :-

نہیں گردش میں کچھ کمِ حرج سے عمر رواں میری
مٹایا اس قدر اُس کی خرامِ ناز نے یارب
کہ ہر دم اک بہارِ نو دکھاتی ہی خسراں میری
کہ باقی ہی فقط اب داستان ہی داستان میری
فنا ہی ماضی و مستقبلِ زندانیاں، لیکن
نمودِ ہستی فی الحال ہی اک چلیاں میری
مجھی سے لے بہارِ جاں فزا آباد ہی گلشن
تری نیزنگیوں کی جان ہیں بتایاں میری

لبیب اس بام پر چڑھنے کی جتنی جستجو کیجے

ہوئی جاتی ہی اتنی ہی فرو تر زردباں میری

خوان مشاعرہ کے ان مزے مزے کے کھانوں میں اچار اور ٹپنی کی کمی حضرت چچا کی غزل پورا کرتی ہے -
یہ بزرگ، سید اسحق احمد صاحب نام، دہلی کے پیرزادے اور شاید اس تخلص کی بدولت ساری دنیا کے چچا بن گئے
ہیں۔ طبیعت میں نہایت ظرافت ہے۔ آپ کی غزل نہ ہو تو مشاعرہ بے دودھ کی چارہ رہ جائے۔ دو مضمون آپ کے
خاص ہیں اور شاید دونوں خود آپ کے تبلیغِ تجربے پر مبنی ہیں۔ یعنی ایک تو اطلبائے حیدر آباد کی خطرناک نوشہری اور
ایک چاندنی رات کی چوریاں کہ اور سب جگہ تو اندھیری راتوں میں چور پڑتے سنے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے حیدر آباد میں
حضرت چچا کو اس کے برعکس سابقہ پیش آیا۔ طرح کی غزل میں آپ کے چند شعر یہ ہیں :-

بھلا کہنے تو کیوں سننے لگا تھا پاسبان میری
شبِ متاب میں اکثر ہوئی ہیں چوریاں میری
مجھے بلوکے خود ہی آپ سن لیں داستان میری
اندھیرا ہی بھلا ہی میں اسی کی قدر کرتا ہوں

جناب شیخ مجبوری ہر اب تو دال حاضر ہی کہ سب کام آگیں نوبت نوبت مرغیاں میری
تلیٹھی، گاسنی کنگ، کہاں تک خلی و خیری دوائیں اب تو بدلے حکیم جاں ستاں میری

لیکن ہیں سب زیادہ خوشی خاص حیدر آبادی شعرا کا کلام سُکر ہوئی۔ تین صاحبوں کی غزلیں جو مشاعرے
میں پڑھی گئی تھیں ہمیں ملی ہیں۔ ان میں سے علام لیلین خاں صاحب جمہور نظم جمعیت کی غزل میں ”آشیاں“
کے قافیے تین جگہ نہایت خوبی سے نظم ہوئے ہیں :-

رہیگا بعدِ بربادی بھی باقی یہ نشانِ میرا اُڑ گی مدتوں گلشن میں خاکِ آشیاں میری
نہیں ہر گلشنِ عالم سے سرسبزیِ مقد ر میں جو سوکھی ہو چمن میں ہی وہ شاخِ آشیاں میری
رہا ہو کر قفس سے بے پروا بالی قیامت ہے نظر اٹھ اٹھ کے رہ جاتی ہے سوئے آشیاں میری

دوسرے صاحب، سید علی نواز رضوی، حیدر آباد کے ایک نامی گرامی خاندان کی یادگار ہیں۔ فکر میں ملندی
اور طبیعت میں جدت ہی۔ اگر مشق و ترقی جاری رہی تو کیا عجب ہے کہ ایک طرز خاص کے مالک ہو جائیں۔ آپ کی
غزل طرچی میں سے بھی ہم نے صرف چند شعر چنے :-

دل روشن یہ کہتا ہی نہیں ہے ضو کہاں میری یہ ساری بزمِ امکان کی ہیں شمعیں جھلکیاں میری
تو اتنا کھل کہ سب تجھ کو گلِ زخمِ جگر سمجھیں اسی میں شادمانی ہی دلِ ناشادماں میری
رہا نا کام منزلِ قافلہ شاید تمنا کا صدے آہ ہی بانگِ درائے کارواں میری
پکار اٹھا ہی دل ”اللہ اکبر“ گر کے قدموں پر نمازِ عشق ہے سجدے میں ہوتی ہی اذال میری

حضرت ساقی حیدر آبادی سے مشاعرے کے اکثر حاضرین واقف نہ تھے۔ لیکن جب آپ نے اپنی غیر طرچ
کی غزل سنائی تو صدائے تحنیں و آفریں سے مشاعرہ گونج اٹھا اور سب متعجب رہ گئے کہ حیدر آباد میں ایسا
بالکمال شاعر بھی پردہ گمنامی میں چھپا ہوا ہے؟ یہ ساری غزل کچھ ایسی مسلسل اور مرصع ہے کہ ہم نے اس میں قطع دبڑ

کرنا ظلم سمجھا اور پوری غزل ذیل میں نقل کر دی۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں :-

مجازاً ہی سہی لیکن حقیقت کو عیاں کر دے
بس اب اے جذبِ الفت ختمِ محبتِ این آں کر دے
حیرم ناز میں اتنا کرم کر جلوہ جاناں
بھلا دے غمگساری راز داں کو بدگماں کر دے
یہ وقت امتحان ہی جلوہ فرمائی سے کچھ پہلے
شکیبائی کو دزدیدہ نگہ سے نیم جاں کر دے
وہ سر جانی ہو اے جذبِ تصور کام کر اپنا
ہماری بیخودی کو پردہ دارِ لامکاں کر دے
بھٹک کر تیری منزل سے قدم گر جاوہ پیا ہو
مٹا دے، خاک کر دے، خاک گردِ کاواں کر دے
سوا ہوں جو عالم سے دلی سرگرمیاں میری
ترے بیمارِ الفت کی اگر قسمت میں صحت ہو
مٹا دے اعتبارِ زندگی کو جیسے جی میرے
تری الفت کا دم بھرنے میں دم بھر کی جو غفلت ہو
مے سوزِ نہاں کو کیا ہی نسبت آتشِ گل سے
تھے جس روز میزانِ عمل میں جنسِ عصیاں کی
مے سوزِ نہاں کو کیا ہی نسبت آتشِ گل سے
فلک کی شعلہ بازی سے عاجز آگیا ساقی
تھے جس روز میزانِ عمل میں جنسِ عصیاں کی
الہی رحم کر۔ برہمِ طلسمِ جسم و جاں کر دے

راقہ ”تماشائی“

تبصرہ

اُردو زبان کی جدید مطبوعات

آداب

مجموعہ کلام جوہر :

مولانا محمد علی صاحب (اکسن) کے اُردو کلام کا یہ مجموعہ جامعہ ملیہ علی گڑھ نے اچھے کاغذ پر صاف و خوش خط چھپوا کر شائع کیا ہے۔ شروع میں مولانا کی تصویر اور مختصر حالاتِ زندگی بھی تحریر ہیں۔ قیمت کہیں نہیں لکھی۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے پچاس صفحات پر چھپی ہے اور اس میں مولانا کی قدیم و جدید کوئی ۲۲ غزلیں اور چند قطعے ہیں۔ بجز قطعہ کے یہ سب غزلیں وقتاً فوقتاً اُردو اخبارات و رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔

مولانا محمد علی اُردو کے پُرگو اور مشتاق شاعر نہیں ہیں، لیکن اُن کے کلام کا یہ مختصر مجموعہ اس بات کا شاہد ہے کہ اگر وہ شعر گوئی کی طرف توجہ فرماتے تو اُن کی ذکاوت اور تخیل کی بلند پروازی غالباً انھیں اُردو کے بہترین شعرا کا ہم رتبہ بنا دیتی۔

چونکہ یہ غزلیں عام طور پر حال ہی میں طبع ہوتی رہی ہیں اور امید ہے کہ اس خوبصورت مختصر مجموعے کو بھی مولانا محمد علی صاحب کے قدرداں احباب ذوق شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ لہذا اس کا نمونہ پیش کرنے کی چذاں ضرورت نہ تھی، صرف رسم پوری کرنے کے لئے ایک غزل کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
ہو منتِ ارباب و فاصسر و توکل چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو، بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ
 ہو حسنِ طلبِ لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا ہو صدقِ طلب پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ
 خو تیری دوروزہ، مراپاں ہی ازل کا پابندِ جفا تو ہی تو میری بھی وفا دیکھ

انتخابِ مضامین رسالہ جوہر:

جامعہ ملیہ علی گڑھ میں جوہر کے نام سے ایک قلمی رسالہ شائع ہوتا تھا "اب" جامعہ کے نام سے باقاعدہ طبع ہونا شروع ہوا ہے اس قلمی رسالے کے اچھے اچھے مضامین کو محفوظ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ انھیں ایک مجموعے کی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ یہی مجموعہ یا انتخابِ مضامین مطبوعہ رسالے کا بھی نہایت عمدہ اشتہار بن گیا ہے۔

یہ مجموعہ ۱۳۸ صفحے پر چھپا ہے۔ کاغذ اور چھپائی معمولی قسم کی ہے۔ شروع میں شیخ جامعہ مولانا محمد علی کی تصویر دی ہے اور انہی سے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ نشر کے مضامین میں اندلس کی تاریخ، کارل مارکس کی تفسیر اشتراکیت، احوالِ زندان وغیرہ عنوانات سے بعض بہت دلچسپ اور کارآمد مضمون چھپے ہیں اور آخر میں بعض نظریوں اور غزلوں کا بھی انتخاب شامل کر دیا ہے۔ کتاب کی قیمت ۴۰ پیسے ہے۔ جامعہ ملیہ کے مہتمم صاحب مکتبہ، جامعہ سے ملے گی۔

مکاتیبِ اکبر:

یہ مولوی اکبر حسین مرحوم اکبر الہ آبادی کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مرحوم نے گزشتہ ۱۱، ۱۲ سال کی مدت میں مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کے نام بھیجے تھے۔ انھیں دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے معمولی کاغذ پر صاف چھپو کر چھوٹی تقطیع کے تقریباً سوا دو سو صفحات پر مجلد شائع کیا ہے اور شروع میں ناظم دائرہ مولوی محبوب علی صاحب نے اکبر کی نظم و نشر پر ایک دیباچہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

مکاتیبِ اکبر، مصنف مرحوم کی پُر نوکسی کا ثبوت ہیں۔ لیکن ان میں اور کوئی علمی یا ادبی خصوصیت

ایسی نظر نہیں آتی کہ ہم بھی فضل دیبا چٹنگار کی مفرد تسلیش کی ہمنوائی کریں۔ باقی اس میں شک نہیں کہ مولوی اکبر حسین صاحب مرحوم نے اپنے خاص طرزِ کلام کی بدولت نظم اُردو میں ایک خاص مرتبہ حاصل کر لیا ہے اور اس لئے اُن کے خیالات اور حالات کے متعلق جو کچھ بھی قلمبند کر لیا جائے وہ آئندہ تذکرہ نویس کے واسطے فائدہ سے اور دلچسپی سے خالی نہوگا۔

چند :

یہ چودہ افسانے اور ایک ڈراما ہے، جنہیں پنجاب کے قابلِ انشا پرداز سردرشن صاحب نے لکھا اور رام کیٹیا بک ڈپو، لاہور نے صاف ستھرا چھپوا کر جلد شائع کیا ہے۔ اس قسم کے مختصر افسانے لکھنے میں منشی پریم چند کو جو کمال حاصل ہے وہ اُردو خواں ناظرین سے مخفی نہیں۔ لیکن زیرِ نظر مجموعے کو دیکھ کر ہمیں نہایت خوشی ہوئی کہ ہمارے ہاں اس میدان کے اور مرد بھی موجود ہیں۔ کیونکہ انصاف یہ ہے کہ چندن کے بعض افسانے کسی طرح منشی پریم چند کے بہترین افسانوں سے کم رتبہ نہیں ہیں اور بعض جگہ خیالات کی بلندی اور زورِ بیان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اُردو زبان میں کیسی کچھ قوتیں مخفی ہیں۔ تقریباً پونے تین سو صفحے کی کتاب میں صرف چند مقام یا الفاظ ایسے نظر آتے ہیں جو شاید ٹکسالی زبان کے استادوں کو کھٹکیں گے ورنہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کسی پنجابی مصنف کے زورِ قلم کی یادگار ہے۔ ہم سردرشن صاحب کو اُن کی ادبی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ علم ادب کی اس صنف کو وہ آئندہ اور زیادہ فروغ دیں گے۔

ان دلچپ افسانوں میں ہیں ”خانہ داری کا سبق“ اور ”کنول کی بیٹی“ کا قصہ سب سے زیادہ پسندیدہ ان میں اخلاقی نکتہ بھی یہاں ہے۔

بحرِ المَجْتَب :

یہ اردو کے نچترے کارِ شاعر مصحفی مرحوم کی مثنوی ہے جو اس سے قبل رسالہ اُردو میں شائع ہو چکی ہے۔ فضل مرتب مولوی عبدالمجید صاحب نے شروع میں ایک مقدمہ مصحفی کی شاعری اور اس مثنوی

کے محاسن پر لکھا ہی جو پڑھنے کے قابل ہے۔ چونکہ زبان کسی قدر قدیم ہے اور قلمی نسخہ ناقص، اس لئے بکثرت حواشی دیئے ہیں (حواشی وہی ہیں جو اردو میں چھپے تھے) بعض بے ضرورت بھی ہیں۔ کتاب سلسلہ آصفیہ کے ذیل میں مطبع معارف اعظم گڑھ میں چھپی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

سائنس

بادل کے بچے :

یہ دلچسپ کتاب پروفیسر فیروز الدین مراد پروفیسر طبوعات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے چھوٹے لڑکوں کے واسطے لکھی ہے اور ۱۱۶ صفحے پر خوش خط چھپو کر شائع کی ہے۔ اس میں بھاپ، بادل، اوٹے برف وغیرہ بننے کے حالات کو قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اس کا ماخذ ایک انگریزی کتاب ”رین چل ڈرن“ ہے۔ اگرچہ یہ کتاب ترجمہ نہیں مگر کہیں کہیں ترجمہ پن صاف نظر آتا ہے اور ہمارے خیال میں بعض عبارتیں اور بعض حصوں کا پیرایہ بیان بھی اتنا آسان اور سلیس نہیں ہے کہ دس بارہ برس کی عمر کا لڑکا بلا دقت سمجھ لے۔ لیکن مجموعی طور پر کتاب بہت اچھی اور قابل قدر ہے اور ہم لائق مولف سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ سائنس کے دیگر مسائل پر بھی اسی قسم کی جس قدر زیادہ کتابیں یا رسالے تحریر کر سکیں ضرور لکھ کر شائع کریں۔

کتاب میں چند تصویریں بھی لگائی گئی ہیں، لیکن یہ ایسی اچھی نہیں جیسی کہ انگریزی کتابوں میں ہم دیکھنے کے عادی ہیں اور شاید سنگی مطبع میں یہ ممکن بھی نہیں۔ تاہم ہمیں اُمید ہے کہ قابل پروفیسر اس کتاب کی طبع ثانی تیز اس قسم کی دوسری کتابوں کی اشاعت کے وقت ان جلدی امور کا ضرور لحاظ کریں گے کہ ان کی سعی زیادہ مقبول و مطبوع ہو۔

نیزنگ ارض (رقیت عظمیٰ)

جغرافیہ طبعی کے موضوع پر یہ مختصر کتاب سید راحت حسین صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ نے

تالیف کی اور مطبع اگرہ اخبار، نئی لہری سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں زمین کی ہیئت، گردش، موسم، کرہ ہوا، پہاڑ، دریا، سمندر، مد و جزر، وغیرہ کو جدید تحقیقات کے مطابق وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ علمی مسائل جبتہ جبتہ اردو کے بعض جغرافیوں اور نصاب کی کتابوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں، لیکن راجسین صاحب نے اچھا کیا کہ انہیں ایک مستقل کتاب کی صورت میں جمع کر دیا۔ جدید طبعیات کے مسائل پر اردو میں کتاب تالیف کرنے کا قابل مولف کو خاص سلیقہ ہے اور ان کی تین کتابیں (القدر وغیرہ) پہلے بھی چھپ کر ملک میں تہنیت حاصل کر چکی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی اس تازہ تالیف کی بھی جس کے ایک مضمون پر بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہ نے مولف کو تین سو روپے انعام عطا فرمایا ہے، اردو خواں حضرات خاطر خواہ قدر کریں گے۔

شکریہ

خلافت موحیدین: مترجمہ جناب مولیٰ نعیم الرحمن حبیب لے پروفیسر عربی۔ گورنمنٹ محمد کالج دہلی (۱۹۶۲ء)

اندلس کے نامور مورخ علامہ عبدالواحد نے ۱۲۱۷ھ میں وہ شہرہ آفاق تاریخ مرتب کی تھی جس کا نام المعجب فی تلخیص اخبار المغرب ہے۔ ۱۸۴۷ء میں ڈاکٹر ڈوری نے یہ کتاب شائع کر دی، اور اب پچھلے سال (۱۹۶۲ء) مولوی نعیم الرحمن صاحب نے ”خلافت موحیدین“ کے نام سے اس کا ترجمہ فرمایا ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے مصنف خاندان موحیدین کا معاصر ہے، اُس کی تاریخ کا وہ بدیع المثال حصہ جو دولت مصادہ یا سلطنت موحیدین سے مخصوص ہے نہایت اہم ہے اور بیشتر واقعات خود اُس کے مشاہدات پر مبنی ہیں، شعار دولت و نظام حکومت کے تذکرے ہماری عام تاریخوں میں نہیں ملتے مگر اس کتاب میں یہ خصوصیت جا بجا نمایاں نظر آئے گی اُس عہد کا تمدن، اُس زمانہ کی معاشرت، اُن دنوں کی تعلیم اور سلاطین کا علمی انماک، یہ ایسے خصائص ہیں جو اس تاریخ کی فضیلت پر بہترین شہادت دے سکتے ہیں، حق گوئی اس کی خاص صفت ہے، مصنف جن سلاطین کا دست گرفتہ ہے اُن کی کمزوریاں ظاہر کرنے میں بھی اُسے باک نہیں، موزین عجم کی طرح وہ بادخوئی

نہیں کرتا۔

بعض تاریخی فوائد خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

مثلاً ایک روایت مشہور ہے کہ ابن تومرت نے ایک عالم و فاضل بزرگ کو عامی و جاہل کی حیثیت میں رہنے کا حکم دیا اور ایک مخصوص موقع پر ان کی علمیت نمایاں کرائی جس کا نہایت مفید سیاسی اثر پڑا اور لوگ اس کو ایک کرامت یا خارق عادت سمجھے، یہ روایت بالکل ہی مجروح تھی اور ایک افسانہ کی حیثیت رکھتی تھی، لہذا مصنف نے اس کو بالکل ہی قلم زد کر دیا۔

قوموں کے عروج و زوال کا وہ بہترین راز داں ہے، اسے معلوم ہے کہ مراطین کی سلطنت کس شان و عظمت کی تھی۔ جمہور میں تعلیم کس قدر پھیلی ہوئی تھی، مدینت میں کیسی کچھ ترقی ہو چکی تھی، باایں سہ یہ قوم مٹ گئی اور اس سلطنت کو زوال آگیا، وہ اس کا سبب محض قوم کی آرام طلبی و تن آسانی بتاتا ہے، جنگی جذبات معدوم ہو چکے تھے، عبدالمومن کا سیلاب آیا تو نہ تعلیم اس طوفان کو روک سکی نہ تہذیب سے بچاؤ ممکن ہوا۔

اندلس کے سب سے بڑے فلسفی ابوبکر بن صالح کی نسبت ابن خلکان کی رائے اچھی نہیں، اس باب میں ابن خلکان کا ماخذ ثعالبی کی ”یتیمۃ الدہر“ ہے جس نے ابن صالح کے احاد کا فتویٰ دیا ہے اور اسی فتوے کی بنا پر فرنگی مستشرقوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فلسفہ کی تعلیم اندلس میں حرام تھی۔ مصنف نے دکھایا ہے کہ ثعالبی کو ذاتی طور پر ابن صالح سے خصومت تھی، ورنہ اندلس میں رواج فلسفہ کا تو یہ عالم تھا کہ خود سلاطین کو بھی اس کا شغف تھا۔

ترجمہ کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ مترجم ایک مستعد فاضل ہیں جن کے روشن ترین علمی مناصب و ادراج کے شاہد وہ حروف مقطعات ہیں جو نام کے ساتھ لوح کتاب پر ثبت ہیں، انہوں نے اور ان کے قابل تعریف خاندان نے تاریخ کی بہت بڑی خدمت کی ہے جس کی قوم شکر گزار ہے۔ ترجمہ میں بعض باتیں محل نظر بھی ہیں:

(۱) فرماتے ہیں ”مسلمانوں نے اندلس کو ۹۲ھ کے ماہ رمضان میں فتح کیا، یہ فتح طارق (اور یہ روایت ابن زیاد اور بہتوں نے ابن عمرو) کے ہاتھوں ہوئی“ (خلافت موحیدین صفحہ ۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتح اندلس یا تو طارق تھے یا بروایات ضعیفہ ابن زیاد و ابن عمرو۔ لیکن اصل

”افتح المسلمون جزيرة الاندلس في شهر رمضان سنة ۹۲ من الهجرة وكان فتحها على ايدي طارق
 قتل ابن زنايد وقيل ابن عمرو“ یعنی مسلمانوں نے ماہ رمضان ۹۲ء میں اندلس کو فتح کیا، یہ
 فتح طارق کے ہاتھوں ہوئی جن کے والد کی نسبت اختلاف ہے بعض نے زیاد کو اور بعض نے عمرو
 کو طارق کا والد بتایا ہے۔ (المعجب صفحہ ۶)

۲ ”طلحہ اور اندلس کے درمیان وہ خلیج ہے جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں اور جو زقاق کے نام سے مشہور ہے
 مجازی طور پر یہ سمجھنا چاہیے کہ موسیٰ بن نصیر امیر قیروان نے اس فتح کو ترتیب دیا۔“
 یہ دو علیحدہ علیحدہ فقرے تھے جن کو مترجم نے ایک کر دیا۔ المعجب کی اصل عبارت یوں ہے:
 ”بینہما (ای بین طنجة) و بین الاندلس الخلیج المذكور المعروف بالزقاق وبالبحار۔ سرتبہ
 موسیٰ بن نصیر امیر القیروان“

مطلب یہ ہے کہ (۱) طلحہ اور اندلس کے درمیان جو خلیج ہے وہ زقاق اور مجاز کے نام سے مشہور ہے (۲) موسیٰ
 بن نصیر نے فتح اندلس کا سامان کر کے طارق سے یہ کام لیا تھا (۳) ترجمہ کے الفاظ ”مجازی طور پر یہ سمجھنا چاہیے“
 حقیقت سے بالکل دور ہیں۔

۳۔ ”طارق موقع وفرت کو غنیمت پا کر جزیرہ خضر کے راستے سے اندلس گئے۔“
 المعجب کی اصل عبارت یہ ہے کہ:

فرک طارق البحر من جهة حجاز الى جزيرة الخضر الفرسية امكنة“

یعنی (۱) طارق سمندر میں ہجاز پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے (۲) روانگی کی سمت جزیرہ الخضر والی وہی خلیج
 تھی جسے ”مجاز“ کہتے تھے (۳) یہ سفر جزیرہ خضر کے راستے سے نہ تھا بلکہ طلحہ مجاز کے راستے سے طے ہو
 ۴۔ ”بیان کیا جاتا ہے کہ ہشام اُن کے قصر میں رہتا تھا، اُن کے حشم میں سے ہشام کے لئے خواص مقرر
 تھے، ہشام اُن کے لئے بطور حاجب کے کام کرتا تھا، اُن کے احکام کا نفاذ اُسی کے سپرد تھا اور وہی اُن کے لئے
 منابر پر دعاؤں کے اجرا کا بندوبست کرتا تھا“ [خلافت مومنین صفحہ ۸۶]

اصل عبارت یہ ہے:

”ذکر ان ہشکما عند البصر، وشہد لہ خواص من حشمہ، وانہ فی صورتہ الحاجب لہ

والمنفذ لاہورہ، وامر بالعداء لہ علی المناہر“ (المعجب صفحہ ۶۶)

یعنی (۱) المعتضد فرماں روا کے اہل بیت بلیغ نے بیان کیا کہ آخری اموی خلیفہ ہشام میرے پاس میرے ہی قہریں موجود ہیں (۲) خاصانِ حشم و خدم نے اس بیان کے سچ ہونے کی شہادت دی (۳) المعتضد نے یہ بھی ظاہر کیا کہ میں نے خلیفہ ہشام کا صرف حاجب ہوں اور ان کے احکام کو نافذ کرتا ہوں (۴) المعتضد نے حکم دیا کہ خلیفہ ہشام کے لئے برسرِ منبر دعا کی جائے، یعنی بجائے معتضد کے ہشام کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔

۵۔ ”المعتضد ہر وقت اہل سرحد کی خبر دریافت کرتے تھے کہ آیا بربری مراکش کے میدان میں اترے ہیں یا نہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بزرگ سے جو ان کے پاس رہا کرتا تھا ان کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ قوم ان سے یا ان کے بیٹے سے خلع کرا سکی“ (خلافت موحیدین - صفحہ ۹۱)

اصل عبارت یہ ہے:

”کان المعتضد فی کل وقت لیستطلع اخبار العدوۃ هل نزل البربر حجة مراکش؟

وذلك لما کان یراہ فی ملحمۃ کانت عندہ ان ہولاء القوم خالعوہ او خالعو ولدہ“ (المعجب صفحہ ۶۶)

یعنی (۱) المعتضد ہر وقت سمندر پار کے حالات دریافت کیا کرتے تھے کہ میدانِ مراکش میں آیا قوم بربر نے پڑاؤ ڈال دیا یا ابھی نہیں (۲) بنائے دریافت یہ تھی کہ آئندہ فتوں کے متعلق معتضد کے پاس پیشین گوئیوں کی ایک کتاب موجود تھی۔ (۳) المعتضد نے اس کتاب میں دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ - یعنی قوم بربر جو مراکش میں فروکش ہونگے یا تو خود معتضد کو سلطنت سے مغرول کر دیں گے یا اُس کے لڑکے کی حکومت چھین لیں گے۔ (۴) ملحمہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی بزرگ تھے جو معتضد کے پاس رہا کرتے تھے اور انھیں سے معتضد کو یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ فتنہ و ملحمہ کی بیسیوں روایتیں اسلام میں موجود ہیں اور احادیث میں ”ملحم و فتن“ کا ایک خاص باب ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں، مگر کچھ بھی ہو، فضل مترجم کا ہم صدق دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کے علمی ذوق سے اردو میں ایک مفید و پاکیزہ کتاب کا اضافہ ہوا جس سے ہم جیسے متعلم کبھی بے نیاز

نہیں ہو سکتے۔

کتاب کا حجم ۳۸۰ صفحے ہے۔ ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت چھ روپے (۶) ملے کا پتہ : مولوی معتمد ولی الرحمن ایم اے۔ نصیر کالج۔ ربانی روڈ۔ لاہور

مہسن و اخلاق

کلید مراد : قیمت ۸

اس مختصر رسالے میں مولانا شفیق عماد پوری نے دعا کے فوائد اور قرآن شریف اور احادیث نبوی کی بعض دعائیں، موقع محل اور ان کے اُردو ترجموں کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں۔ شروع میں خواجہ حسن نظامی کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ آخر میں مناجاتیں اور صوفیہ کے منظوم شجرے درج ہیں۔ کتاب صاف خوش خط چھپی ہے۔ مگر قیمت کسی قدر زیادہ ہے۔

اعظم الاخلاق :

اس کتاب کی تالیف پر سید منظر علی صاحب (خلف مولانا امجد علی صاحب اشہری مرحوم) کو سرکار نظام الملک آصف جاہ کی جانب سے پچاس روپیہ ماہانہ کا تاحیات وظیفہ بطریق انعام مرحمت ہوا ہے۔ اور کتاب شہزادگان بلند اقبال کے اسمائے گرامی سے معنون کی گئی ہے۔ اس کتاب میں لائق مولف نے اخلاق حمیدہ جیسے احسان، سخاوت، استقلال، صبر، تحمل، ادب، تواضع وغیرہ کے ۵۰ عنوان قرار دیئے ہیں اور ہر عنوان کے معنی کی صراحت کر کے ذیل میں مختلف مافذوں سے چند کارآمد اور عمدہ مقولے نقل کئے ہیں۔ ان مقولوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا اور نہ اس کی چنداں ضرورت تھی لیکن ہمارا خیال ہے کہ انھیں زیادہ سلیس اور شگفتہ زبان میں نیز کسی خاص ترتیب کے ساتھ لکھا جاتا تو ان کی دل چسپی میں اضافہ ہوتا۔ اس قسم کی خشک نصیحتیں لڑکوں لڑکیوں کے لئے اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتیں جب تک ان میں کوئی

دل چسپی کا سامان پیدا نہ کیا جائے۔
کتاب کی قیمت اور ملنے کا پتا کہیں درج نہیں

اردو کے جدید رسالے

جامعہ :-

یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا ماہوار علمی رسالہ ہے جو اس سال سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس میں اکثر مضامین طلبہ جامعہ ملیہ کے ہیں۔ علاوہ شذرات کے چار مضامین نشر کے اور تین نظمیں ہیں پہلا سیاسی انقلابات کا اثر علوم ایران پر، دوسرا سیاست بین الاقوامی پر، تیسرا مسئلہ تادان جنگ پر، چوتھا ہندوستانی تعلیم کا مرکز پر (جو ڈاکٹر ٹیگور کے مضمون کا ترجمہ ہے) ان کے علاوہ جرمنی سے کسی نامہ نگار نے دو مختصر خط لکھے ہیں۔ نظمیں دو غزلیں ہیں اور ایک نظم رویاے صادقہ پر ہے۔ اگرچہ رسالہ یونیورسٹی کی شان کا نہیں ہے، لیکن مضامین مفید اور پر از معلومات ہیں حقیقت میں ایسے مضامین کی ضرورت بھی ہے تاکہ ہمارے اہل وطن موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات اور سیاسی اور معاشی مسائل سے آگاہ رہیں۔ چونکہ اس کے لکھنے والے زیادہ تر طلبہ ہیں، اس لحاظ سے رسالہ قابل تعریف ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس رسالے کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ووصاف اور صحیح زبان میں ملک کے اردو داں طبقے کی خدمت میں ان تمام مسائل کو پیش کرے جن کا جاننا اس زمانہ میں نہایت ضروری ہے۔ بے خبری بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کا رفع کرنا درحقیقت نیکی ہے۔ اگر جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ اس مقصد کو پیش نظر رکھیں تو ملک پر بڑا احسان کریں گے اور تعلیم کے حقیقی نشا کو پورا کریں گے۔

رسالہ کا حجم ۶ صفحہ ہے اور چنبدہ سالانہ چار روپیہ

نظام کالج آرمیگزین :-

یہ رسالہ اسی سال جاری ہوا ہے۔ اس کے شائع کرنے والے اور لکھنے والے

نظام کالج (حیدرآباد دکن) کے طلبہ ہیں۔ اس کے مقاصد ”مقالہ افتتاحیہ“ میں یہ بتائے گئے ہیں :-
 ”یہ بغیر کسی تخصیص یا امتیاز کے تمام طلبہ کا سچا رفیق و مشیر اور رخص طلب ہوگا۔ اس میں
 ایسے مضامین شائع ہونگے جو ادبی ذوق رکھنے والے ناظرین کی تفریح طبع کا
 باعث ہونگے۔“

کالج کے پچاس سالہ قیام میں یہ پہلا وقت ہے کہ وہاں کے طلبہ نے اس قسم کی ادبی کوشش کی ہے۔ اساتذہ اہل
 الگ ہیں۔ سارا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں ہے اور مضامین بھی سب کے سب طلبہ ہی کے معلوم ہوتے ہیں جن میں قدیم
 اور جدید طلبہ دونوں شریک ہیں۔ مضامین اوسط درجہ کے ہیں جو مستعد اور شوقین طالب علموں کی سعی و کوشش
 کا نتیجہ ہیں۔ مضامین ادبی اور تاریخی ہیں۔ پانچ چھ نظمیں بھی ہیں۔ اگر یہ رسالہ اردو ادب کا صحیح ذوق پیدا
 کرنے میں کوشش کرے تو بڑا کام کرے گا۔ یہ معمولی کام نہیں۔ اس میں بڑی محنت اور تلاش و جستجو کی ضرورت
 ہے۔ لیکن اس کے نتائج بہت قابل قدر اور بیش بہا ہیں۔ صحیح ذوق سے انسان کے خیالات اور اخلاق پر نہایت
 اچھا اثر پڑتا ہے اور اس کی زندگی میں بڑا تغیر اور انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ طلبہ اور عام پڑھے لکھے لوگوں میں صحیح
 ذوق ادب پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے اور اگر یہ رسالہ اس کام کو اپنے ذمہ لے تو کچھ تعجب نہیں کہ اس کی کوشش
 بار آور ہو اور ملک کے خیالات میں تغیر پیدا کر دے۔

ہم نظام کالج کے طلبہ کو اس ادبی تحریک پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اسے دکن کا ایک
 اچھا رسالہ بنانے کی کوشش کریں گے۔
 رسالہ کا حجم ۴۰ صفحہ ہے اور سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے۔

الناظر:

کچھ دنوں بند رہ کر اب پھر جاری ہوا ہے۔ الناظر کے پرجوش اور مستعد ڈیڑھ برس اس زمانے میں
 جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان سے کم و بیش لوگ واقف ہیں۔ یہ رسالہ انھیں اس قدر غریب ہے کہ باوجود ان تمام
 مصائب کے انھوں نے اپنی غیر حاضری میں بھی اسے جاری رکھنے کی کوشش کی، لیکن اس میں کامیابی نہوئی

اب بڑے گھر سے واپس آ کر انھوں نے پھر اسے جاری کیا ہے۔ اس کی وہی شان ہے جو پہلے تھی۔ مضامین بھی بالکل اُسی قسم کے ہیں جیسے پہلے ہوتے تھے۔ ”نظرے خوش گزرے“ میں وہی تشدد آمیز شوخی ہے۔ ہم مولوی ظفر الملک علوی کو اس استقلال پر داد دیتے ہیں۔ وہ سب دنیوی علاقے چھوڑنے کے لئے آمادہ ہیں مگر انظار کی محبت ان کے دل میں ایسی ہے کہ اُسے چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ سوائے کتابوں کے اشتہار کے انھیں یا کسی دوسرے کو کسی قسم کا فائدہ نہیں۔

ظلال السلطان :

تین سال بند رہنے کے بعد اس جنوری سے پھر شائع ہوا ہے اور خواتین کی خدمت پر پہلے سے زیادہ آمادہ نظر آتا ہے اور کان کپڑا تاہر کہ آئندہ کبھی ایسی تاخیر اور قصور نہ کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جو اردو کے نئے نئے رسالے نکلے تو مولوی محمد امین صاحب ”زبیری“ کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوئی اور انھوں نے ظلال السلطان کو از سر نو پھر شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ مضامین اور ترتیب کا ڈھنگ وہی ہے جو پہلے تھا۔ حجم ۴۰ صفحہ سالانہ چندہ تین پیسہ چار آنے مقام اشاعت بھوپال۔

ستلج :

یہ رسالہ دسمبر ۱۹۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اب تک اس کے دو نمبر ہمارے پاس پہنچے ہیں۔ مقام اشاعت لودیانہ (پنجاب) ہے۔ اڈیٹر نے اس کا مقصد یہ قرار دیا ہے۔ ”اردو علم ادب کی ترقی اور کامیابی اہل ملک کو نئے نئے علوم و فنون سے آگاہ کرنا مختلف اصنافِ ادب میں جدت پیدا کر کے اردو زبان کو دنیا کی ایک بہترین علمی زبان بنانا۔ اس کے بعد وہ خود ہی سوال کرتے ہیں کہ دوسرے رسالے بھی تو اپنے مقاصد یہی بیان کرتے ہیں تو ستلج کو نئی بات پیدا کرے گا؟ اس کا جواب بھی وہ خود ہی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”اُردو زبان کے دو جدید کی ابتدا سے لے کر آج تک کے رسائل و صحائف کو دیکھا جائے، سب

ایک ہی لکیر کے فقیر نظر آئیں گے۔ وہی قلم کی گھس گھس، وہی ادبی ”ٹکڑہ“، وہی علمی مضمونچہ، قصہ نویسی کی طرز ہی تو پارینہ، انش پر داری کا ڈھنگ ہی تو فرسودہ۔ حصہ نشر میں وہی پامال شدہ مضامین قطعہ نظم میں وہی قافیہ اور ردیف۔ روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں میں درج ہونے والے مضامین ماہوار رسالوں میں لکھ کر سرے سے ایک بلاسی آتا رہی جاتی ہے۔ ناظرین کے علمی مذاق کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاتا۔ قارئین کی ذہنی اور دماغی ترقی کی طرف کچھ توجہ نہیں کی جاتی اور نہ ان میں تخیل کا مادہ پیدا کر کے ان کے رشحات قلم کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لیکن سٹیج اگر خدانے چاہا تو ان قلمتوں کو پورا کرے گا۔ نفاص کا ازالہ کرے گا، نیادھنگ اختیار کرے گا۔ جدید طرز پر چلے گا۔ زبان اردو کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کے لئے سعی بلیغ کرے گا۔ ادق سے ادق مسائل کو ایک عام فہم زبان میں بیان کرے گا۔ نئے خیالات اور انوکھے جذبات سے تعارف کرائے گا۔ وغیرہ وغیرہ“ دعویٰ بہت بڑا ہے۔ اس کا ایک حصہ بھی پورا ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ سٹیج کی روانی زمین ادب کو بہت کچھ سیراب کر دے گی۔ ان دونوں میں اس کے آثار کم نظر آتے ہیں۔ لیکن اس میں خراشک نہیں کہ رسالہ بہت دلچسپ ہے۔ اس کے قصے انوکھے اور لطیف پر لطف ہیں۔ ہونمار نظر آتا ہے اور آگے بڑھنے کا دم خم رکھتا ہے دوسرے نمبر کا پہلا مضمون جس کا عنوان ”اقتطاع عالم میں اردو بولنے والے“ ہی پڑھنے کے قابل ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے سے قبل یہ خیال کرنا ناممکن تھا کہ برکسر، رے ویلا ماڈلیں، یو جی (جرمنی مشرقی افریقہ) چلی میں بھی اردو بولنے والے ملیں گے۔ اسی رسالے کے آخر میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔ روپیہ ہم ٹھہچانے کی یہ تدبیر سوچی گئی ہے کہ مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی قائم کی جائے جس کا سرمایہ ایک لاکھ روپیہ ہو جو دس دس روپے کے دس ہزار حصوں میں منقسم ہو۔ اس سے پہلے بھی اردو انسائیکلو پیڈیا کے متعلق کمی باتیں تجویز ہوئیں مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس سے بڑھ کر ہمیں کسی بات کی مسرت نہ ہوگی کہ سٹیج اس میں کامیاب ہو۔ بعض لطائف، معامات اور مضامین کے لئے افادات بھی مقرر کئے ہیں۔

انسوس کہ لکھائی چھپائی اچھی نہیں۔ کاغذ بھی ناقص ہے۔ امید ہے کہ لوالوغرم اڈیٹر اس کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کریں گے۔

قیمت سالانہ پانچ روپے (حجم ۸۰ صفحے)

الکمال :

یہ رسالہ نومبر ۱۹۲۲ء سے نکلتا شروع ہوا ہے۔ اس کا اصل مقصد ملک میں تجارت، صنعت و حرفت کا شوق پھیلانا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی صدری اور مجرب نسخے اور طب، ادب، تاریخ پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ بعض مضمون بہت کارآمد بھی ہوتے ہیں۔ ہماری رائے میں اگر وہ اس رسالے کو صنعت و حرفت اور تجارت ہی تک محدود رکھیں تو بہت مناسب ہو۔ یہ میدان کچھ کم وسیع نہیں لیکن جب ان مضامین کے ساتھ ہم غزلیں اور نظمیں بھی دیکھتے ہیں تو یہ چیزیں بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ صنعت و حرفت کے حصے میں بعض مفید کارآمد اور تجارتی اشیاء کے بنانے کے نسخے بھی درج ہیں۔ اگر اس کا مقصد خاص حد تک محدود کر دیا جائے تو یہ رسالہ ملک کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اڈیٹر آغا بشیر خاں ریاض شروانی ہیں۔ مقام اشاعت دہلی۔ سالانہ چندہ للحدہ طلبہ و مستورات سے علاوہ محصول عرصہ بڑی تقطیع پر دو کالم میں لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔

تصویر وفا :

یہ رسالہ بھی حال ہی میں نکلتا شروع ہوا ہے۔ سرورق پر سب اور پر لکھا ہے ”ہندوستان بھر کے تمام اُردو رسالوں کا ستاراج ماہوار رسالہ“ اس سے نیچے اتر کر یہ الفاظ نظر آتے ہیں: ”علمی، ادبی، اخلاقی، تاریخی، تمدنی، طبی، ظریفی، روحانی دل چسپیوں کا ماہوار مجموعہ“ اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے اکثر عنوانوں پر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہے خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو۔ شعر و سخن کی چاشنی کا بھی خیال رکھا گیا ہے چھپا اچھا نہیں اور کاغذ چھپائی سے بھی خراب ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے۔ مقام اشاعت لودیانہ (پنجاب)۔



اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سالہ ہی رسالہ 'ہی جو جنوری'، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔

۲۔ یہ غاصل ادبی رسالہ ہی جس میں زبان ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔
حجم کم سے کم ۱۵۰، اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحہ ہوگا۔

۳۔ قیمت نو روپے بارہ آنے سالانہ معہ محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اُردو سے آٹھ روپے بارہ آنے

۴۔ تمام خط و کتابت آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو واڈیٹر اُردو اورنگ آباد سے ہونی چاہیے
رہا تمام محمد مقتدی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔

صفحہ ۱۰

۲۲۰۵

۸۰۳۸۷۳
رسالہ اردو بابت نومبر ۱۹۲۲ء

۲۱۷

۵۲۷
۱۵۷

کتابت
جامعہ
۱۔ اردو میں
۲۔ اردو میں
۳۔ اردو میں
۴۔ اردو میں
۵۔ اردو میں
۶۔ اردو میں
۷۔ اردو میں
۸۔ اردو میں
۹۔ اردو میں
۱۰۔ اردو میں
۱۱۔ اردو میں
۱۲۔ اردو میں
۱۳۔ اردو میں
۱۴۔ اردو میں
۱۵۔ اردو میں
۱۶۔ اردو میں
۱۷۔ اردو میں
۱۸۔ اردو میں
۱۹۔ اردو میں
۲۰۔ اردو میں
۲۱۔ اردو میں
۲۲۔ اردو میں
۲۳۔ اردو میں
۲۴۔ اردو میں
۲۵۔ اردو میں
۲۶۔ اردو میں
۲۷۔ اردو میں
۲۸۔ اردو میں
۲۹۔ اردو میں
۳۰۔ اردو میں
۳۱۔ اردو میں
۳۲۔ اردو میں
۳۳۔ اردو میں
۳۴۔ اردو میں
۳۵۔ اردو میں
۳۶۔ اردو میں
۳۷۔ اردو میں
۳۸۔ اردو میں
۳۹۔ اردو میں
۴۰۔ اردو میں
۴۱۔ اردو میں
۴۲۔ اردو میں
۴۳۔ اردو میں
۴۴۔ اردو میں
۴۵۔ اردو میں
۴۶۔ اردو میں
۴۷۔ اردو میں
۴۸۔ اردو میں
۴۹۔ اردو میں
۵۰۔ اردو میں
۵۱۔ اردو میں
۵۲۔ اردو میں
۵۳۔ اردو میں
۵۴۔ اردو میں
۵۵۔ اردو میں
۵۶۔ اردو میں
۵۷۔ اردو میں
۵۸۔ اردو میں
۵۹۔ اردو میں
۶۰۔ اردو میں
۶۱۔ اردو میں
۶۲۔ اردو میں
۶۳۔ اردو میں
۶۴۔ اردو میں
۶۵۔ اردو میں
۶۶۔ اردو میں
۶۷۔ اردو میں
۶۸۔ اردو میں
۶۹۔ اردو میں
۷۰۔ اردو میں
۷۱۔ اردو میں
۷۲۔ اردو میں
۷۳۔ اردو میں
۷۴۔ اردو میں
۷۵۔ اردو میں
۷۶۔ اردو میں
۷۷۔ اردو میں
۷۸۔ اردو میں
۷۹۔ اردو میں
۸۰۔ اردو میں
۸۱۔ اردو میں
۸۲۔ اردو میں
۸۳۔ اردو میں
۸۴۔ اردو میں
۸۵۔ اردو میں
۸۶۔ اردو میں
۸۷۔ اردو میں
۸۸۔ اردو میں
۸۹۔ اردو میں
۹۰۔ اردو میں
۹۱۔ اردو میں
۹۲۔ اردو میں
۹۳۔ اردو میں
۹۴۔ اردو میں
۹۵۔ اردو میں
۹۶۔ اردو میں
۹۷۔ اردو میں
۹۸۔ اردو میں
۹۹۔ اردو میں
۱۰۰۔ اردو میں

